چارہ گر

قمر جہاں

چارہ گر

(افسانوی مجموعہ)

قمر جہاں

انتساب

اپنے ماموں محترم
جناب علیم اللہ حالی کے نام
اس احساس کے ساتھ
ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

قمر جہاں

"میں نے آج سمجھ لیا کہ ادبی خدمت، پوری
عبادت ہے۔"

منشی پریم چند

ترتیب

حرفِ آغاز ۶

جمود ۱۰

چارہ گر ۱۵

آج کی عورت ۳۰

اپنے ہوئے پرائے ۴۰

ممتا کی خوشبو ۴۶

ڈوبتا سورج ۵۳

جنت بھی، جہنم بھی ۶۳

کہانی ایک مزار کی ۷۰

ایک معمہ ۷۷

سونی ڈگر ۸۵

وہ لڑکی ۸۹

بند کوٹھری ۹۶

لمحوں کی صدا ۱۰۱

صدا بہ صحرا ۱۰۸

"میں" کی تلاش میں ۱۱۳

حرفِ آغاز

میرے نزدیک قصہ کہانی جاگتی آنکھوں کا خواب ہیں، لہٰذا میں یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ میری کہانیاں وہ خواب ہیں جنھیں میں نے چلتے پھرتے، عالمِ ہوش میں دیکھا ہے اور پھر ان بیدار آنکھوں کے خواب کے بعد مجھ پر ایک وجد کی کیفیت طاری رہی ہے اور اگر اس عالمِ وجد میں میں نے قلم ہاتھ میں اٹھا لیا ہے تو عموماً کہانی آسانی سے گرفت میں آگئی ہے، ورنہ زندگی کے ڈھیر سارے گریز پا لمحوں کی طرح یہ قیمتی لمحے بھی رائیگاں رہے ہیں اور پھر شاید بڑی مشکل سے دوبارہ وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس میں خود بخود قلم بھاگتا جاتا ہے ـــــ میری اکثر کہانیاں اسی لمحہ کی پیداوار ہیں، لیکن مجھے دکھ ہے کہ میں نے ـــــ نہیں، بلکہ میری زندگی کی مجبوریوں نے بہت سارے قیمتی لمحوں کو برباد کر دیا ہے۔

خیر یہ غم بے حاصلی ہی تو فن کی حیات کا ضامن ہے ـــــ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر شخص کو وہی کچھ ملتا ہے جو اس کے مقدر کا حصہ ہے۔

یہ کہانیاں چونکہ جاگتی آنکھوں کا خواب ہیں اس لئے ان میں خواب سے زیادہ حقیقت کا رنگ ہے، زندگی کی ٹھوس اور کٹیلی حقیقتیں، ـــــ خصوصاً اس طرف میں جو بھی کہانیاں لکھ رہی ہوں انہیں فن کاری ہے یا نہیں ـــــ یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں لیکن حقیقت کا وہ روپ تو ضرور موجود ہے جس نے میری روح کو زخمی کیا ہے۔ میرے احساس میں ہزاروں کرچیاں چبھو دی ہیں ـــــ شاید اسی لئے کہیں کہیں ان میں تلخیاں بھی ابھر آئی ہیں ـــــ لیکن، میں وہ حسن کہاں سے لاؤں، وہ گیت آپ کو کہاں سے سناؤں جو زندگی کے شیریں ترین لمحوں کا عطیہ ہوتے ہیں ـــــ میرے پاس تو دکھ درد ہے، کبھی اپنا کبھی غیروں کا، کبھی ذاتی، کبھی اجتماعی ـــــ لہٰذا آپ سے معذرت کے ساتھ میں بس اتنا کہوں گی ؎

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
دردو غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

میں نے بھی محض جذبۂ شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ چند صفحات رنگین کئے ہیں ـــــ ان کا رنگ آپ کو کیسا لگا؟ یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں۔! میرے لئے تو یہ محض ایک شوق ہے ـــــ اور ہاں، یہ شوق شاید بچپن سے میری روح میں رچ بس گیا تھا۔ کچھ حد تک ننیہالی پس منظر کا بھی اس پر اثر رہا ہوگا، کیوں کہ میرے پرنانا سید حافظ عبداللہ مشکی پوری مرحوم

اپنے زمانے کے ایک اچھے شاعر گزرے ہیں، پھر بڑے ماموں اسداللہ غالب، چھوٹے ماموں علیم اللہ حالی (صدر شعبۂ اردو گیا کالج) اور خالو محترم شاہ فیاض عالم دیغم بھی شاعر و ادیب ہیں ـــ ان حضرات کے علاوہ میرے والد بزرگوار سید عطاء الحق مرحوم اگرچہ خود شاعر و ادیب نہیں تھے لیکن ان کی ادب نوازی بڑی مشہور تھی ـــ

آج جب میں اپنا محاسبہ کرنے بیٹھی ہوں تو مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میرے ذہن میں ادب کا بیج بونے میں ان تمام عوامل و عناصر کا ہاتھ ضرور رہا ہوگا، لیکن مجھے تو صرف اسی قدر یاد ہے کہ میرے لکھنے کی ابتدا کالج لائف میں داخل ہونے کے فوراً بعد ہوئی ہے ـــ سب سے پہلی کہانی "جنونِ وفا" کے عنوان سے فروری ۱۹۶۳ء میں پٹنہ کے مشہور ماہنامہ "صبحِ نو" میں شائع ہوئی تھی۔

پیشِ نظر مجموعہ میں میں نے اس دور کی کہانیاں شامل نہیں کی ہیں کیونکہ اس وقت کی کہانیوں میں جذبات ہی جذبات ہیں ـ نمونہ کے طور پر میں نے اس مجموعہ میں اس دور کی صرف ایک کہانی "چارہ گر" شامل کی ہے ـــ ویسے "چارہ گر" کی اشاعت میری لاپروائی اور تساہلی کی وجہ سے بہت تاخیر سے ہوئی ہے۔ بقیہ تمام کہانیاں ادھر گذشتہ چند سالوں کے اندر لکھی گئی ہیں ـــ یہ کیسی ہیں؟ کیا ہیں؟؟ اس کا فیصلہ تو آپ کی پسند و ناپسند پر ہے ـ! اگر آپ کو پسند آگئیں تو یہ میری خوش بختی اور اگر ناپسند آئیں تو یہ میری بے بضاعتی کا اظہار ہوگا۔

خیر جو بھی ہو ـــ، دونوں ہی صورت میں مجھے آپ کے مشوروں کا انتظار رہے گا ـــ، کیونکہ آپ کی رائے تنقیص پر مبنی ہو کہ تحسین پر ـــ یقیناً میری رہبری ہی

کریں گی ——— ،

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں مَیں ان تمام حضرات کی شکر گزار ہوں، جنھوں نے مجھے برابر لکھتے رہنے کی ترغیب بخشی ہے ——— خصوصی طور پر میں عم محترم جناب اختر حسین آفتاب صاحب، جناب لطف الرحمان صاحب، جناب عبید قمر صاحب اپنے خاوند جناب بدر الحسن صاحب اور برادرم لطیف عالم صاحب کی ممنون ہوں جنھوں نے اشاعت کے سلسلہ میں مجھے اپنے نیک مشوروں سے نوازا ہے ۔!!

••

قمر جہاں

۳ر نومبر ۱۹۸۲ء

بھیکن پور، ٹٹیا۔ بھاگل پور

سڑک پر جم غفیر تھا ـــــــــ

اس کا رکشہ جب وہاں پر پہنچا تو اس کا دل چاہا کہ وہ رکشا روک کر اس مجمع کا سبب دریافت کرے لیکن اسی لمحہ اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور رکشا والے کو حکم دیا کہ وہ تیزی سے رکشا نکال لے۔

رکشا والے نے اس کے حکم کی تعمیل میں مجمع کو چیرتے ہوئے رکشا کو اپنے دونوں ہاتھوں پر کھینچتے ہوئے آگے بڑھا لیا۔

آگے بڑھ کر اس نے پوچھا :۔

"یہ بھیڑ کس لئے تھی ۔؟"

"کوئی مر گیا ہے ۔" رکشا والے نے لاپروائی سے جواب دیا۔

اور اسے لگا جیسے مرجانا کس قدر آسان فعل ہے۔ آج کی دنیا میں انسان کی موت کتنی سہل ہوگئی ہے۔ یہی ایک ایسا فعل ہے جسکے لئے کوئی انتظار نہیں، کوئی وقت نہیں، کوئی اہتمام نہیں، جب اور جہاں چاہا مر گئے ـــــ اب دیکھو نا! بھلا بیچ سڑک پر اس طرح بے وقت مرجانا بھی کیا عجب فعل ہے۔ اسے قضاو قدر کے مالک پر ہنسی آئی ـــــ

خیالات کے تانے بانے میں الجھتے الجھتے وہ اپنے گھر کے قریب پہنچ چکی تھی ـــــ رکشا سے اتر کر اس نے دروازہ پر لگے ہوئے بند قفل میں کنجی ڈال کر گھمائی، دروازہ کھل گیا۔

اس نے پرس میں سے کچھ پیسے نکال کر رکشا والے کے حوالے کئے اور خود اندر داخل ہوگئی۔

بند کمرے کی گرم ہوائیں اس کے مشامِ جاں سے ٹکرائیں۔ اس کی دن بھر کی تھکی ہوئی طبیعت مزید مکدر ہونے لگی تو اس نے جلدی سے بند دریچے اور دروازے کھول دیئے تاکہ تازہ ہوائیں کمرے کے حبس کو دور کردیں۔ اور خود بیرونی دروازہ لگا کر اندر برامدے میں آگئی ـــ گھڑی پر نظر گئی تو ساڑھے پانچ ہونے جارہے تھے۔

"راجو اور اس کے پاپا اب تک نہیں آئے ہیں۔"

سوچ کی ایک لہر اس کے ذہن کو چھو سی گئی ـــــ

"کہیں اس مجمع میں وہ لوگ بھی تو شامل نہیں تھے ـ؟"

اس نے خود سے سوال کیا ـــــ

وہ باتھ روم میں جاکر ڈریس بدل ہی رہی تھی کہ اسکے میں کال بیل

بجنے لگی اور وہ لپک کر دروازہ کھولنے چلی گئی۔

راجو کے پاپا کو تنہا دیکھ کر اس نے اداس ہوتے ہوئے پوچھا: "راجو اب تک نہیں آیا جی ــــ؟"

"آتا ہی ہوگا" ــــ انھوں نے لاپروائی سے جواب دیا۔ پھر گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"ممکن ہے وہ اس مجمع کو دیکھ کر رُک گیا ہو۔ سنا ہے عین کچہری چوک پر کوئی بیچارہ بس سے کچل کر مر گیا ہے۔"

"آپ نے بھی نہیں دیکھا۔؟" اس نے چائے کی کیتلی گیس اسٹوپ پر چڑھاتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا

"مجھے تو گھر آنے کی جلدی تھی ورنہ میں رک کر ضرور دیکھتی، کافی بھیڑ تھی ــــ"

"اجی! ایسے حادثات تو روز کا معمول بن چکے ہیں، ــــ کس کس کا ماتم کیجیے اور کس کس کو روئیے۔"

"ہاں یہ تو ہے ہی ... آج کے دور میں انسان کی زندگی ... ..."

وہ ابھی اپنا جملہ ختم بھی نہ کرنے پائی تھی کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی ــــ کھولتی ہوئی چائے کو گیس پر چھوڑ کر وہ تیزی سے فون کی طرف لپکی۔ ریسیور اٹھا کر "ہیلو، ہیلو" کرنے لگی اور دوسرے ہی لمحے پاگلوں کی طرح چیخ مار کر زمین پر گر پڑی:

"ہائے وہ تو میرا اپنا راجو تھا۔ میرا راجو، اب میں کہاں سے لاؤں سے لاؤں راجو کو ... ... میرا ... را ... جو ..."

اس کے بَین کی دلدوز آوازیں پوری فضا کو ہیبت ناک

بنائے ہوئے تھیں اور اس کا شوہر کسی مجسمہ کی طرح ساکت و جامد اپنی جگہ پر اس طرح جم گیا تھا جیسے صدیوں سے اسی جگہ پر کھڑا ہو ۔!!

••

ماہنامہ "شاعر" جون جولائی ۱۹۷۹ء

چارہ گر

وہ بوجھل بوجھل قدموں سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی سب سے اوپر کی منزل پر آئی جہاں دو کمرے کا اس کا مختصر سا فلیٹ تھا ـــــ بالائی منزل پر آکر اس نے ایک طویل گہری سانس لی اور ایک لمحہ کو رکی، بند دروازے کو خالی خالی نظروں سے کچھ دیر تک دیکھتی رہی اور پھر ہلکے سے دستک دی۔ بند دروازہ کچھ وقفے کے بعد اچانک کھل گیا اور اس کے سامنے ایک کمزور و ناتواں سی ضعیفہ کھڑی تھی۔

"ماں! آج تمھارا من کیسا ہے؟" اس نے ڈوبتی آواز میں دریافت کیا اور اندر داخل ہوگئی لیکن ماں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اپنی طرف سے یہ سوال کر دیا۔

"بیٹا! آج تو دن میں کیوں نہیں آئی؟ میں سارا دن تیری راہ تکا کی۔"

"ہاں، ماں! آج میں بہت مصروف رہی۔ سارے دن بالکل چھٹی نہیں ملی۔ کئی بار آنا چاہا، لیکن چھٹی ایک دم نہ ملی۔"

ماں خاموشی سے اس کا منہ تکتی رہی اور وہ کہتی رہی:

"میں بہت تھک گئی ہوں ماں، کچھ کھانے وانے کو ہے تو بتا، میں کھا کر سونا چاہتی ہوں۔"

ماں رسوئی گھر کی طرف چلی گئی اور وہ ہاتھ منہ دھونے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔

ماں نے پیتل کے چمکتے ہوئے پرات میں کھانا پروس کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ لیکن اس کا دل کچھ کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ سی خاموش بیٹھی رہی ——— ماں نے ٹکارا دیا:

"کیوں بیٹی! بیٹھی کیوں ہے؟ کھانا تو کھا۔"

"تم بھی کھاؤ نا ماں!"

"میں تو کھا چکی ہوں۔ صرف تیرا کھانا ہے۔"

اس نے روٹی کے دو تین ٹکڑے توڑ کر منہ میں ڈال لئے اور گلاس اٹھا کر پانی پی کر اٹھ گئی۔

ماں کو حیرت ہوئی، آج انجنا اتنی افسردہ کیوں ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے تو وہ بہت خوش رہتی تھی۔ ہر وقت اس کے مکھڑے پر تبسم ہی رہتا تھا۔ اس کا دل چاہا، انجنا سے وہ اس کی اداسی کی وجہ پوچھے۔ لیکن اسے اس طرح افسردہ اور خاموش دیکھ کر ہمت نہ ہوئی، صرف اتنا بولی:

"کیوں بیٹا! طبیعت تو اچھی ہے نا۔؟"

"طبیعت اچھی ہے۔ آج تھک بہت گئی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ماں کو تسلی دی اور خود اپنے تاریک کمرے میں آکر بستر پر گر گئی۔ بستر پر پڑے ہی پڑے اس نے دریچہ کی طرف دیکھا۔ چاند کی ہلکی ہلکی شبنمی روشنی دریچہ سے چھن چھن کر کمرے میں آرہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھی اور دریچہ کے پردے کو ایک طرف سرکا دیا۔ کمرہ اچھا خاصہ نیم تاریک ہوگیا۔ وہ پھر آکر بستر میں گر گئی۔

اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور آج دن کے واقعات اس کے ذہن پر ایک شدید حادثہ کی صورت میں منقش ہوگئے تھے ——— اپنی توہین، اپنی تضحیک پر وہ دل ہی دل میں تلملا اٹھی تھی لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ خاموشی کے سوا اس کے پاس اور چارہ ہی کیا تھا۔

اس کے ذہن میں اجیت کا خوبصورت چہرہ اب بھی رقصاں تھا۔ لیکن اس خوبصورت چہرے کے پیچھے اس کا دل ——— اُف! اسے معلوم نہ تھا۔ اس نے خواب میں یہ نہ سوچا تھا کہ اجیت ایسا ہے۔ وہ سمجھتی تھی وہ ایک عظیم شخصیت ہے۔ لیکن ..... لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ وہ یادوں کے سیلِ رواں کے ساتھ بہنے لگی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں ———

تین مہینے پہلے اجیت اس کے ہاسپٹل میں آیا تھا۔ جس وقت وہ داخل ہوا تھا اس کی کیا حالت تھی، وہ آج بھی نہیں بھول سکی ہے۔ وہ بالکل مرنے کے قریب تھا اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس کے ساتھ

اس کا کوئی اپنا پرایا بھی نہ تھا۔ اجیت کا بس سے شدید ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا اور ایک اجنبی شخص نے اسے ہاسپٹل میں داخل کردیا تھا۔ اس وقت وہ بالکل ہوش میں نہ تھا کہ کوئی اس سے اس کے اپنے پرائے کا پتہ پوچھتا اور نہ تو اس کے پاس ایسی کوئی چیز ملی جو اس کے گھر بار کا پتہ دیتی۔

جب چوبیس گھنٹے کی مسلسل بیہوشی کے بعد وہ ہوش میں آیا اور اس نے اس سے اس کے رشتہ داروں کے بارے میں کچھ دریافت کرنا چاہا تو وہ عجیب عجیب باتیں کرنے لگا۔

میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے سسٹر! مجھے کس نے بچالیا۔ میں تو مرنا چاہتا تھا۔ مجھے مرنے کیوں نہیں دیا گیا۔ مجھے کیوں بچالیا گیا۔ بولو سسٹر! مجھے کیوں بچالیا گیا ——؟

وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا تو نرس نے اسے سمجھایا۔

"Oh Dear Patient! you are very fool" زندگی کو تم نے سمجھا نہیں۔ زندگی خودکشی کے لئے نہیں ہوتی۔ زندگی نام ہے مَر مَر کے جیے جانے کا۔ مرجانا تو بہت آسان ہے۔ تم دیکھنے میں تو جوان ہو، لیکن بزدلی تم نے کہاں سیکھی؟"

ایک لمحہ کو اس نے نرس کی طرف غور سے دیکھا تھا۔ یہ خوبصورت معصوم چہرہ اور اتنی عقل کی باتیں۔ زندگی اور موت کا یہ عرفان اس معمولی نرس کو کیسے حاصل ہوگیا۔ نوجوان نے مبہوت نظروں سے اس کی طرف غور سے دیکھا تو نرس مسکرا پڑی۔

"آپ کیا دیکھ رہے ہیں میرے چہرے میں۔ کیا آپ کو کوئی اور نظر آرہا ہے مجھ میں ——؟"

"اونہہ ہنہہ —— میں سوچتا ہوں، تم کتنی دانا ہو۔ اس عمر میں زندگی کا یہ شعور۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے جینے کا یہ فلسفہ کہاں سے سیکھا ——!"

"خود اپنی زندگی سے!" نرس نے ایک افسردہ تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

"اوہ! تو کیا تمھاری زندگی اتنی کربناک ہے؟"

"ہاں بہت زیادہ! شاید تم سے بھی زیادہ!"

"نہیں نہیں مجھ سے زیادہ نہیں!" اجیت کے لہجہ میں بیتابی تھی۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تمھاری زندگی میں وہ کون سا دکھ ہے جس نے تمھاری زندگی کو اتنا تلخ بنا دیا کہ تم خودکشی پر مجبور ہو گئے؟"

"نہیں نہیں میں نہیں بتا سکتا نرس۔ میری سسٹر، میری ڈیر سسٹر! مجھے تم اس سلسلے میں زیادہ مجبور نہ کرو۔"

مریض بے حد مضطرب سا ہو گیا تھا۔

"اچھا اچھا میں آپ کو مجبور نہیں کرتی، لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ اس دکھ کو بھول جائیے اور زندہ رہنا سیکھئے۔"

"کیا تم سکھا دو گی؟"

مریض نے نرس کی آنکھوں میں غور سے جھانکتے ہوئے پوچھا

تھا اور پھر خود ہی بول پڑا۔

"ہاں میں نے یہ ہُنر سیکھ لیا!"

"کہاں" ـــــ نرس نے حیرت سے پوچھا۔

"تمھاری آنکھوں سے۔" نوجوان نے شوخ لہجے میں کہا اور بغور نرس کو دیکھتا رہا۔

نرس کو اس کی اتنی شوخ اور بے باک باتیں سُن کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ وہ مریض جو ابھی کچھ گھنٹہ پہلے بیہوش تھا اور ہوش میں آنے پر بھی پاگل بنا ہوا تھا، اتنی جلد ایسی شوخ اور زندگی سے بھرپور باتیں کر رہا ہے۔ اسے اپنی مسیحائی پر کچھ فخر بھی ہوا۔ لیکن پھر بھی اس کا دل چاہا کہ وہ اسے ٹوک دے کہ اس کی یہ شوخی اسے پسند نہیں آئی۔ ذرا انتظار تو کرتا اظہارِ محبت کے لئے۔ لیکن وہ اپنی بات کو اتنے خشک انداز میں نہ کہہ کر یوں مخاطب ہوئی:۔

"جی ہاں، میری یہ آنکھیں سبھی کو یہ درس دیتی ہیں!" اس نے "سبھی" پر خاص زور دیا۔ لیکن نوجوان بھی شاید جواب کے لئے تیار ہی بیٹھا تھا۔ بول اٹھا:

"اگر میں اسے صرف اپنے لئے مخصوص کر لوں تو.....؟"

اس نے اچانک ایک ایسا سوال کر دیا تھا کہ نرس سوچ میں پڑ گئی ـــــ ہاسپٹل سے گھر آکر وہ بہت دیر تک سوچتی رہی تھی کہ یہ کیسا نوجوان ہے؟ اس نے خودکشی کیوں کی ہوگی؟ اتنی جلد اس سے اتنا بے تکلف کیوں کر ہو گیا؟ یہ مجھ سے فلرٹ تو نہیں کر رہا ہے ـــــ؟ لیکن یہ

ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا دل تیزی سے اسکی طرف کھنچتا چلا گیا۔

وہ ایک خوش گوار شام تھی، موسم گل کی طرح۔ اس شام کے حسین واقعہ کو وہ کبھی بھول ہی نہیں سکتی۔ وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں میں ٹھوڑی رکھے اجیت کی طرف کچھ جھکی ہوئی اس کے سامنے رکھی تپائی پر بیٹھی نہ جانے کس خیال میں ڈوبی تھی کہ بے محابہ اجیت نے یہ شعر پڑھا ؎

اپنی معصوم نگاہی کو ذرا کم کر لو
نگہِ شوق کو اس طرح حجاب آتا ہے

اس نے چونک کر نظر اٹھائی تو اجیت کو اپنی طرف عجیب نظروں سے گھورتے پایا۔ اسے اس طرح اپنی طرف دیکھتے پاکر وہ بول اٹھی۔ 'آپ کو اور حجاب آئے!' اور مسکرادی۔ اس کے صبیح رخسار شفق گوں ہو گئے۔

انجنا کے اس جواب پر وہ زور سے ہنس پڑا۔

"ہاں انجو! نہ جانے تم میں وہ کون سی کشش ہے کہ میں اپنے آپ کو بھی بھولتا جا رہا ہوں۔"

"جی ہاں کیوں نہیں! اور جیسے ہی یہاں سے باہر جائیں گے تو پھر میری یاد اور میرا تصور بھی خلاؤں میں کھو جائے گا۔"

"نہیں انجو ——— ! میں اب یہاں سے کہیں نہ جاؤں گا۔" اجیت نے کہا ——— !

"تو کیا آپ کا کریا کرم بھی یہیں ہو گا!" اس نے بہت شوخی

سے اجیت کو چھیڑا تھا۔ لیکن وہ بھی غضب کا ذہین تھا۔ مسکراتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"یہاں نہیں تمہارے گھر میں!" اجیت کے اس جواب پر نہ جانے کیوں اس کا دل دھڑکنے لگا۔

اور اس دن بھی وہ اس نوجوان کے بارے میں دیر تک سوچتی رہی تھی۔ لیکن اس دن وہ اپنے بارے میں بھی سوچ رہی تھی۔ اپنی طویل تنہا زندگی کے بارے میں! جس سے وہ اب بالکل اکتا گئی تھی۔ اسے ایک عرصہ سے ایک ایسے ساتھی کی تلاش تھی جو ساری زندگی اس کا ساتھ دے اور اس کی دھوپ میں تپتی ہوئی زندگی پر اپنی وفا کا سایہ ڈال دے۔ اجیت کو دیکھ کر اس کی محبت اور خلوص سے بھرپور باتیں سنکر اس کی تاریک زندگی میں روشنی کی ایک کرن پھوٹی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ روشنی کی یہ کرن دائمی اور ابدی بن جائے اور اتنی پھیل جائے کہ اس کی پوری زندگی کو منور کر دے۔ اب تک ہاسپٹل میں نہ جانے کتنے دل پھینک نوجوان آئے تھے۔ لیکن جو بات اس نے اجیت میں محسوس کی وہ اوروں میں کہاں؟ وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگی ؎

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

وہ سوچتی اس کا یہ احساس اس خیال پر بھی مبنی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اور اجیت کی زندگی میں بہت یکسانیت و قربت پاتی ہے۔ اسے بھی زندگی کے کانٹوں کی تیز چبھن اکثر خودکشی پر مجبور کرتی ہے۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے بالکل بیزار ہو گئی تھی۔

اپنے نرسنگ پیشہ سے اکتا گئی تھی۔ اس کا دل شدت سے چاہتا تھا کہ کاش! اس کے ہاتھوں میں بھی دوسری لڑکیوں کی طرح مہندی لگے، اس کے آنگن میں بھی سہیلیاں ڈھولک کی تھاپ پر سجن کے میٹھے مدھر اور پریم رس میں ڈوبے گیت گائیں۔

——— اور ..... اور کوئی سانولا سجیلا نوجوان آتا اور اسے اپنی بنا کر لے جاتا۔ اس پاپ کی بستی اور گندی نگری سے دور، بہت دور ——— ہاسپٹل کا یہ اکتا دینے والا ماحول ..... دواؤں، ڈیٹولوں، اسپرٹ وایتھر کی دم گھٹا دینے والی فضاؤں سے اسے نفرت سی ہو گئی تھی۔ جہاں جایئے جس طرف نظر اٹھایئے مریض ہی مریض۔ گندے، غلیظ اور حیات وموت کی کشمکش میں مبتلا مریض۔ کہیں سر دلاش، کہیں بدبودار گھناؤنا زخم آلودہ جسم! ——— دل کا زخم ہو تو اس پر پھاہے لگانے میں بھی لطف آئے۔ لیکن جسم کا یہ گھناؤنا گھاؤ کتنا کریہہ معلوم ہوتا ہے۔ ان پر مرہم پٹی کرتے ہوئے کتنی کراہیت آتی ہے۔ لیکن وہ کیا کرے، چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جو وہ نہیں کرنا چاہتی اور یہیں تک بس نہیں ہوتا۔ اس سے بھی زیادہ پریشان کن ڈاکٹروں اور ہاؤس سرجنوں کی حریصانہ نظریں ہیں جو ہر شام بڑھتی ہوئی تاریکی کے ساتھ سفید پوش نرسوں اور سسٹروں کے پیچھے منڈلاتی رہتی ہیں اور کسی سینما گھر یا ہوٹل میں چلنے کا اشارہ کرتی رہتی ہیں، جیسے یہ نرسیں بس اسی مقصد کے لئے ہیں۔ اب تک تو انجنا ان نگاہوں کو بے نیازی سے

ٹھکراتی رہی ہے جس کی سزا عموماً دوسرے ہی دن معمولی معمولی غلطیوں پر ڈاکٹر کی ڈانٹ پھٹکار سے اسے ملتی رہی ہے۔ لیکن اس نے اس کی پروا نہ کی اور اب تک ان حریصانہ نظروں سے خود کو بچائے رکھنے میں کامیاب رہی ہے۔ لیکن کب تک ——

—— کاش اس سے پہلے کوئی اسے اس دنیا کی غلاظتوں سے نجات دلا کر دور کہیں دور —— پیار و محبت کی حسین وادی میں لے جاتا جو اس کی اپنی دنیا ہوتی۔ جہاں پیار و محبت اور اپنائیت کے مدھر سنگیت سے اس کا انگ انگ مسرور رہتا۔ لیکن اس کی یہ سہانی آرزوئیں پھول کو چھونے اور چاند کو چھونے کے مصداق تھیں، کیوں کہ زندگی کی یہ مسرتیں عام سہی لیکن اس کے لئے دیوانے کا خواب ہیں، جس کی کوئی تعبیر نہیں۔

اس کے اور اس کی ماں (جو حقیقت میں اس کی حقیقی ماں نہیں، پوس پالک ماں ہیں) کے ہزار چاہتے ہوئے بھی اب تک کوئی بھی اسے اپنی بنانے کو تیار نہ ہوا۔ وہ خوبصورت بھی ہے، جوان بھی ہے اور خوش مزاج بھی۔ پھر بھی کوئی اس سے شادی کرنا نہیں چاہتا کیوں کہ وہ نرس ہے۔ ایک ایسی نرس جس کے باپ ماں کسی کا پتہ نہیں، اس کا کس مذہب، کس ذات سے تعلق ہے کسی کو اس کا بھی علم نہیں۔ وہ خود بھی نہیں جانتی۔ بس اتنا جانتی ہے کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا ہے اس نے اپنے آپ کو اسی ہاسپٹل میں نرسنگ کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے

پایا اور اسی بوڑھی ماں کو اپنے ساتھ پایا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ بوڑھی عورت کون ہے؟ اس سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ وہ بس اتنا جانتی ہے کہ اسی عورت نے اس کی پرورش کی ہے۔ اسی لئے وہ اس سے ہمدردی رکھتی ہے اور وہ بھی اسے ماں کی طرح چاہتی ہے۔

لیکن اجیت کی ملاقات اور اس کی باتوں سے بہت جلد وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ وہ اسے اس تاریک دنیا سے نجات دلا کر رنگ و نور کی دنیا میں لے جائیگا۔ اور یہی وہ جذبہ تھا کہ وہ اجیت کو بالکل اپنا سمجھ کر اپنائیت اور خلوص سے اس کی خدمت میں دن رات ایک کئے ہوئے تھی۔ اجیت تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا اور اسے اتنا جلد صحت یاب ہوتے دیکھ کر وہ بے حد مسرور تھی۔

لیکن ایک شام ... ایک شام اچانک انجنا کی طبیعت ناساز ہو گئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مجبور ہو کر ایک ہفتہ کی رخصت لے کر آرام کے لئے گھر بیٹھ گئی ——— اور جب ایک ہفتہ کے بعد وہ ہاسپٹل پہنچی تو اجیت کو اپنے بیڈ پر نہ پا کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے وارڈ کے دوسرے مریضوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا ابھی ابھی وہ بچ گیا ہے۔ اس کے رشتہ دار اسے لینے آ گئے ہیں اس کا دل ڈوبنے لگا اور وہ تیزی سے نیچے اتری۔ سامنے پورٹیکو میں اجیت کھڑا ٹیکسی میں سامان رکھوا رہا تھا۔ اجیت اسے دیکھ کر بہت تپاک سے مسکراتا ہوا آگے بڑھا ——— "ہیلو مس انجنا! ہاؤ آر یو؟"

"How are you ?" .....

"yes, yes, I am well, But... but" اجیت نے اس کی بات پوری بھی نہ ہونے دی اور بول پڑا ——

"اچھا ہوا' تم آگئیں۔ مجھے تمہارا بہت انتظار تھا۔ جانتی ہو انجنا! میں ایک دن صرف تمہارے انتظار میں رُک گیا' ورنہ میرا نام کل ہی کٹ گیا تھا ——"

"شکریہ! لیکن تم ..... تم جا رہے ہو؟" نرس حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں انجو! اب میں تمہاری دنیا سے دور بہت دور جا رہا ہوں۔ لیکن تم سے یہ التجا ہے کہ مجھے بھول نہ جانا۔ تمہارے لئے تو یہ آسان بھی ہے۔ کیوں کہ آج ہی میری جگہ کو بھرنے کے لئے کوئی دوسرا مریض آجائے گا۔ لیکن تم..... تم تو مجھے ہمیشہ یاد رہو گی۔ تمہارے لطف و کرم کو میں بھول نہیں سکتا۔ —— اچھا انجنا! اب مجھے اجازت دو۔ دیکھو میری صاحبہ مجھے میرا انتظار کر رہی ہے۔" اجیت نے ٹیکسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا —— اس نے مُڑ کر دیکھا' ایک جوان عورت شانِ دل ربائی سے بیٹھی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

انجنا پر جیسے بم گر گیا! —— "مسٹر اجیت! کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

"ہاں انجو! میری شادی کو تین سال ہو چکے ہیں۔ آؤ میں تمہیں

اپنی مسز سے ملاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ ٹیکسی کے قریب پہنچ گیا۔ اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہونا چاہتا تھا کہ انجنا پوچھ بیٹھی:

"لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ آپ کا کوئی نہیں ہے۔ آپ مرنا چاہتے تھے..... آخر یہ جھوٹ آپ نے کیوں تراشا ——— ؟"

اور اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اس کی بیوی بھی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"معاف کرنا انجنا! اور تم بھی مجھ پر شک نہ کرو ڈارلنگ!" اس نے اپنی بیوی کو بھی مخاطب کر لیا۔ "میں نے یہ جھوٹ اس لئے تراشا تھا کہ مجھے معلوم تھا کہ اگر تم یہ جانتی کہ میری شادی ہو چکی ہے ..... تو تم مجھ پر نوازش و کرم کی وہ بوچھار نہ کرتیں، جس نے مجھے اتنی جلد صحت یاب کر دیا۔ بولو انجو! کیا تم مجھ سے اسی طرح ملتیں؟" وہ زور سے ہنستا ہوا ٹیکسی کے اندر داخل ہو گیا اور اپنی بیوی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی بھی مسکرا رہی تھی اور..... اور انجنا کو اپنا سارا وجود آگ کی بھٹی میں دہکتا ہوا محسوس ہوا ——— اجیت اور اس کی بیوی کی مسکراہٹ نے اس آگ کو اور تیز کر دیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ایک زور دار طمانچہ اجیت کے منہ پر رسید کر دے۔ لیکن ٹیکسی چل چکی تھی ——— اور وہ حیرت سے اڑتے ہوئے غبار کو دیکھتی رہی۔

جب کافی دیر کے بعد اس کی طبیعت ذرا سنبھلی

تو وہ بوجھل بوجھل قدموں اور ڈوبتے دل کے ساتھ اپنے فلیٹ کی طرف چل پڑی۔

••

ماہنامہ "بیسویں صدی" دہلی
نومبر ۱۹۷۲ء

آج کی عورت

اس نے دونوں بچوں کو ٹفن دے کر اسکول بس پر سوار کیا اور پھر جلدی سے آکر منا کے لئے دودھ تیار کرنے لگی، دودھ کو پاٹ میں ڈال کر جلدی جلدی ٹھنڈا کیا، پھر دودھ کی بوتل بچہ کے ننھے منے ہاتھوں میں تھما کر خود باتھ روم میں گھس گئی۔ دو ہی منٹ میں باتھ روم سے نکل کر بیڈ روم میں آئی اور ہینگر سے لگی ہوئی ساڑی اپنے جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی ——— جلدی جلدی ہلکا سا میک اپ کیا۔ بچہ کے قریب آئی، ایک پیار بھرا بوسہ اس کی پیشانی پر دیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

چلتے چلتے رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ گھڑی کی سوئی بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے

وہ بھی گھڑی کی سوئی کی ہی رفتار سے بھاگنے لگی۔ یہ روز روز کی بھاگ دوڑ بھی کیسی عجیب ہوتی ہے۔ وہ ہر روز سوچتی ہے کہ وقت سے پہلے ہی تیار ہو کر گھر سے باہر نکل جائے گی لیکن ہر روز کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ تاخیر ہو ہی جاتی ہے اور اس وقت اسے احساس ہوتا ہے کہ نوکری کرنے والوں کے لئے کبھی کبھی پانچ منٹ بھی کتنے قیمتی ہوتے ہیں ——— خواہ مخواہ باس کے سامنے شرمسار ہونا اسے پسند نہیں تھا، لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی اکثر وہی کچھ ہوتا تھا جو وہ نہیں چاہتی تھی ———

کالج پہنچ کر لائبریری روم کے سامنے کھڑے ہو کر اسے دو منٹ یہ سوچنے میں لگا کہ آج وہ اپنے باس سے کیا بہانہ بنائے گی ——— کاش اس کے روم میں جانے کے لئے الگ سے دروازہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس طرح باس کے روم سے ہو کر گذرنے میں اسے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ خاصکر جب تھوڑی بھی تاخیر ہو جائے تو معاملہ اور بھی پریشان کن ہو جاتا تھا

وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی باس ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب ہوئیں: "لیٹ آنا آپ کی عادت بن چکی ہے مسز صادق۔ اب مجھے پرنسپل آفس میں Complain دینا ہوگا۔"

"نہیں میڈم، ایکسکیوزمی ....." وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ اسلئے وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور تیزی سے اپنے

کام میں لگ گئی۔

دن بھر ایک انداز میں بیٹھی بیٹھی وہ بالکل بور ہو جاتی تھی۔ اسے اپنا کمرہ ایک چھوٹا سا قید خانہ لگتا تھا۔ اس قید خانہ میں اس کی کرسی کے سامنے کی طرف ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی اس کھڑکی کی سلاخیں اس انداز میں کٹی ہوئی تھیں جس سے لڑکیاں دن بھر لائبریری کارڈ لینے کے لئے اپنے ہاتھ اندر بڑھایا کرتی تھیں اور اسی راستہ سے وہ کتاب بھی لیتی دیتی تھیں ——

دن بھر طرح طرح کی لڑکیاں کوئی الٹرا ماڈرن کوئی سیدھی سادی، کوئی خوبصورت، کوئی بدصورت، کوئی بش شرٹ پتلون میں ملبوس، کوئی شلوار جمپر میں اور کوئی ساڑی میں ملبوس ——

—— اس دریچہ کے پار چھوٹے سے کمرے میں آکر کھڑی ہو جاتیں اور اپنے شور و غل سے اس کے ذہن کو پراگندہ کرتی رہتیں ——

"دیدی! ابھی میرا کلاس ہے، پہلے مجھے دے دیجئے۔"

اور کوئی کہتی "نہیں دیدی! پہلے مجھے دیجئے، میں پہلے سے کھڑی ہوں ——"

پھر آوازوں کے اس گھنے جنگل سے ایک اور آواز ابھرتی۔

"دیدی جلدی دیجئے نا ——"

اور وہ پریشان ہو کر کہتی ——

"تم لوگ "کیو" میں کیوں نہیں رہتی ہو؟ جاؤ میں کسی کو نہیں دوں گی ——؟"

لڑکیاں وقتی طور پر "کیو" میں ہو جاتیں لیکن پھر وہی ہنگامے

اور شوخیاں ـــــــ روز روز کے اس ہنگامے اور شور شرابے سے اکثر اس کے سر میں درد ہو جاتا اور وہ سوچتی " یہ نوکری ہے یا دردسری "

اکثر دل چاہتا ـــــــ

" اس دردسری سے وہ ریزائن کر کے اپنے شوہر کے پاس مع بچوں کے چلی جائے ۔ یہاں اسے زندگی کی کون سی خوشیاں نصیب ہیں ـــــــ ؟"

گھر جاتی ہے تو کسی کو بھی اس سے ہمدردی نہیں ہوتی ـــــــ ساس صاحبہ سوچتی ہیں کہ وہ دن بھر اس کے بچے کی کھلائی رہی ہیں اس لئے اب انھیں آرام سے سونا چاہیئے ۔ بچے سوچتے ہیں کہ ممی دن بھر غائب رہی ہیں اس لئے اب انھیں خوب تنگ کرنا چاہیئے ـــــ کبھی کبھی اسے اپنے شوہر کی کمی کا احساس ہوتا ہے لیکن پھر سوچتی وہ رہتے بھی تو کیا کرتے ۔ وہ تو اسے اور بھی الجھا دیتے ہیں ۔ " دوست پر دوست آرہے ہیں ' چائے پر چائے بن رہی ہے ۔ شرٹ کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں ' ذرا لگا دو ' انگنی کہاں ہے ؟ رومال کہاں ہے ۔ ؟ ؟ وغیرہ وغیرہ ـــــــ

ـــــ غرض ایک عجیب ہنگامہ رہتا ہے ان کے رہنے سے لیکن اس ہنگامے سے بھی وہ خوش رہتی تھی ' کیوں کہ شوہر کی قربت ایک بہت بڑی قوت تھی لیکن اب تو وہ بھی کبھی اپنے کو بڑی بے سہارا محسوس کرتی تھی ـــــــ

آج سے دس سال پہلے کتنی دلکشی تھی اس نوکری میں جب وہ نوکری میں آئی تھی اتنی وقت اس کی شادی ہوئی تھی ـــــــ گھر میں بھی کوئی کام کاج نہیں تھا۔ اس کے شوہر اکثر اسے پہونچانے کالج جاتے تھے اور پھر شام کو اس کے انتظار میں بے قرار رہتے تھے۔ اس وقت ان کی بیقراری اسے کتنی اچھی لگتی تھی۔ لیکن اب تو جیسے وہ بھی عادی ہو چکے ہیں جب ہی تو دوسرے شہر میں بھی اس کے بغیر کتنے مزے میں رہ رہے ہیں۔ اس نے سوچا تھا وہ وہاں جا کر اس کی کمی بے حد محسوس کریں گے اور بہت جلد اس سے استدعا کریں گے کہ تم نوکری چھوڑ کر میرے ساتھ چلی چلو، مجھے ایسی نوکری نہیں چاہیئے۔ لیکن یہ تو محض اس کے تصور کا بھرم نکلا۔ اب تو وہ کبھی ان سے نوکری چھوڑنے کا تذکرہ بھی کرتی ہے تو وہ گھبرا کر کہتے ہیں ـــــــ

"یہ حماقت ہے شہناز! آج کے دور میں نوکری ملنی آسان نہیں ہے۔ لگی ہوئی روزی کو چھوڑنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ بعد کو تمہیں پچھتانا پڑے گا۔"

اور وہ سوچتی ہے کہ عورت کی قسمت میں تو ہمیشہ پچھتانا ہی ہے۔ وہ ابھی بھی پچھتا رہی ہے اور بعد کو بھی پچھتائے گی۔ اس نے تو خود کو ایک ایسے مایا جال میں پھنسا لیا ہے کہ اب خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے ـــــــ

لیکن آج کے واقعہ نے تو اسے تلملا ہی دیا ہے۔ اس کا سب سے چھوٹا بچہ تیز بخار میں بھن رہا ہے۔ اس کی خواہش کالج جانے کی نہیں ہو رہی تھی لیکن اس کے پاس ایک بھی کیژوَل لیو (رخصت اتفاقیہ) نہیں تھی۔ اگر وہ چھٹی لیتی تو تنخواہ کٹ جاتی ——— اس نے سوچا تھا کہ وہ کالج جا کر اپنے باس کو اپنے حالات بتائے گی اور تھوڑی دیر کام کرنے کے بعد "باس" سے اجازت لے کر گھر چلی جائے گی اس طرح تنخواہ کٹنے سے بچ جائے گی۔ وہ ساس سے کہہ گئی ———

"اماں! میں بارہ بجے تک آجاؤں گی، جب تک آپ بابو کو بہلائیں گی ———"

جاتے وقت بچہ اس کی ساڑی کا آنچل نہیں چھوڑتا ہے وہ بڑے پیار سے اس کی معصوم پیشانی کو چومتی ہے اور گردن اور ہونٹ پر بوسہ دیتے ہوئے کہتی ہے:—

"میرے منا! میں ابھی آجاتی ہوں تمہارے لئے دوا اور بسکٹ بھی تو لانا ہے۔ پاپا تو نہیں ہیں نا بیٹے۔ اس لئے دوا اور بسکٹ کون لائے گا میرے منا کے لئے ———"

"اور ٹافی بھی ممی ..... لیکن جلدی آنا ممی۔ جلدی آنا ممی۔"

بچہ کی گڑگڑاتی ہوئی آواز دیر تک اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ وہ تیزی سے نکل کر رکشا پر بیٹھ گئی ———

کالج پہونچ کر اس کا دل کام کرنے میں بالکل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن مجبوراً کام میں خود کو مصروف رکھنے کی وہ کوشش کرنے لگی۔

باس ابھی تک نہیں آئی تھیں، اسے بے قراری سے ان کا انتظار تھا۔ گیارہ بجے کے قریب باس آئیں، وہ لپک کر ان کے روم میں گئی لیکن باس کا مزاج ہی آج برہم تھا۔ وہ سامنے دیکھتے ہی الجھ پڑیں:——

"آپ لوگوں کو کام سے بالکل مطلب نہیں ہے۔ دیکھئے! ان کتابوں کو آئے ہوئے کتنے دن ہو گئے ابھی تک ان کی انٹری نہیں ہوئی ہے۔ اگر میں خود ان چھوٹے چھوٹے کاموں کو کرتی رہوں تو آپ لوگ کس مرض کی دوا ہیں۔؟"

اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس وقت اگر وہ گھر جانے کی بات کرتی ہے تو وہ اور برہم ہو جائیں گی۔ اس لئے تھوڑی دیر ان کے مزاج کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرنا چاہئے ——— یہ سوچ کر وہ اپنے روم میں واپس آ گئی اور انٹری کا کام شروع کرنا چاہا لیکن آج اس کی طبیعت کام کرنے میں بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ رہ رہ کر بچہ کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی ———

"ممی جلدی آنا۔"

اس کا قلم بے اختیاری میں رجسٹر پر چل رہا تھا اور ذہن گھر کی طرف ——— اتنے میں باس آ کر کھڑی ہو گئیں اور

رجسٹر کی طرف دیکھتے ہوئے گرجیں :—

"مسز صادق! میں محسوس کر رہی ہوں کہ اب آپ کا دل کام کرنے میں بالکل نہیں لگتا ہے — دیکھئے آپ نے کیا غلطی کی ہے —"

رجسٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھا —

وہ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی اور ہمت کر کے بولی۔

"معاف کریں گی میڈم، آج میں بے حد پریشان ہوں میرا بچہ بیمار ہے، میں نے چاہا تھا کہ آج ....."

وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر سکی کہ باس برس پڑیں :—

"آپ کے ساتھ تو روز یہی دھندہ لگا رہتا ہے۔ کبھی بچہ بیمار ہے، کبھی خود بیمار ہیں، اگر آپ کو چھٹی لینی ہے تو جائیے پرنسپل سے کہیے، میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ لوگوں کو جس قدر چھوٹ دی جاتی ہے اتنا ہی آپ لوگ آرام چاہتی ہیں —"

اتنا کہہ کر باس چلی گئیں اور وہ سوچتی رہی کہ اگر وہ پرنسپل آفس میں جائے اور وہ بھی چھٹی نہ دیں تو وہ کیا کرے گی کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے آج کی چھٹی کے لئے ایک درخواست لکھی، آدھا سے زیادہ دن وہ کام کر چکی تھی لیکن اب اس سے مزید کام نہیں ہو سکتا تھا۔ چھٹی ملنے

کی امید نہیں تھی اس لئے اس نے بلا تنخواہ (Without Pay)
ہونا منظور کر لیا لیکن اپنے بچہ کو وہ اب زیادہ دیر تک تنہا
نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس کی آواز اس کی ممتا کو للکار رہی تھی "ممی
جلدی آنا ——"

ایک بجنے والا تھا۔ گھر پہونچتے پہونچتے دو بج جائیں گے،
بیکار ہی اس نے اتنا وقت برباد کیا۔ کاش! وہ آتے کے ساتھ
ہی چھٹی لے لیتی، اس افسوس کے ساتھ وہ پاس کے کمرے میں داخل
ہوئی۔ ٹیبل پر پیپر ویٹ کے نیچے درخواست رکھ کر وہ جانے کے
لئے مڑی تو باس نے حیرت سے اس کی جرات رندانہ کو محسوس کیا
لیکن کچھ کہا نہیں، وہ غم و غصہ سے نڈھال ہو کر آگے بڑھ گئی۔ رکشا
کر کے وہ تیزی سے گھر پہونچنا چاہتی تھی لیکن آج راستہ کی دوری اسے
ہر دن سے زیادہ کھل رہی تھی۔ پونے دو بجے کے قریب وہ گھر پہونچی
دروازے پر ساس بچے کو لئے بہلا رہی تھیں، اسے دیکھتے ہی ابل پڑیں
"آج کی عورتوں کے پاس دل نہیں ہے، پتھر ہے پتھر، بچہ
بیمار ہے اور میم صاحب کو نوکری کی ہی فکر ہے ——"

●●

ماہنامہ "زبان و ادب" پٹنہ
جولائی ۱۹۷۹ء

اپنے ہوئے پرائے

آج صبح سے ہی اس کا دل اداس تھا لیکن رات کی تاریکی میں تو اس کی اداسی اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ یہ بھی کیا دن تھے جب اس کے دل میں کیسے کیسے حوصلے تھے، زندگی گذارنے کے لئے کیسے کیسے بلند خواب تھے، تمنائیں اور خواہشات تھیں وہ زیر لب گنگنانے لگی ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس نے بتی جلائی اور ایک بار آئینہ کے سامنے پھر سے اپنے سراپا کا جائزہ لیا اور کچھ دیر خاموشی سے آئینہ کو دیکھتی رہی کہ دیکھیں آئینہ کیا کہتا ہے۔

آئینہ بھی کیا شے ہے، اپنی گونگی زبان میں کیا سچ بات کہہ جاتا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ آئینہ پر نقاب

ڈال دے یا خود اپنے اوپر یا وقت کی بے رحمی کے اوپر .....
..... لیکن رات کی تنہائی میں تمام چیزیں برہنہ تھیں۔ اس کا دل بھی برہنہ تھا اور تمام زخم جاگ چکے تھے لوگ کہتے ہیں: ——

Time is the best killer of all sorrows. ——

لیکن اس کے ساتھ تو الٹا ہی ہوا۔ گذرتے لمحوں کی چاپ سے رُندتے رُندتے اس کے تمام زخم اور بھی گہرے ہو گئے ہیں ——

ماضی کے جھروکے میں اس نے جھانکا تو ایک خوبصورت مگر زرد زرد کمزور سا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ اسے اس چہرے سے کبھی بے حد پیار تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک دن یہ چہرہ پھول کی طرح کھلے گا، اس کی زردی گلابی رنگت میں بدل جائے گی اور دور دیش کا کوئی اجنبی آکر اس چہرے کی صحیح قدر و قیمت لگائے گا اور وہ مسکراتی ہوئی، پیا ملن کے گیت سنتی ہوئی، بابل کے گھر سے ایک اجنبی کے گھر چلی جائے گی ..... اجنبی .... اجنبی نہیں رہے گا بلکہ وہ تو اس کی زندگی بن جائے گا۔ وہ ٹوٹ کر اس سے پیار کرے گی اور اپنے گھر کو جنت کا نمونہ بنا دے گی۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

وقت دبے قدموں گذرتا گیا ——— زرد زرد چہرہ تھوڑا ابھر آگیا اور اس کی رنگت پہلے سے بھی زیادہ نکھر گئی، آنکھوں سے شراب چھلکنے لگی ——— لیکن اس کے سپنوں کا وہ اجنبی شہزادہ نہ جانے کن راستوں میں بھٹک گیا تھا۔ ——— وہ انتظار اور ابھی، اور ابھی..... ... ... اور ابھی کے بے سود نعرے الاپتی رہی۔ شروع میں وہ اپنے تصوراتی شہزادہ کے لئے سال چھ ماہ میں دلہن کی طرح سجتی سنورتی رہی اور ہر بار آئینہ دیکھ کر خود ہی شرما جاتی، کوئی اس کے کانوں میں چپکے سے کہتا:——

"ہاں بہت خوب لگ رہی ہے تو..... ... ..."

لیکن دوسرے ہی لمحے تلخ اور کڑوی صداقتوں کا سامنا ہوتا اور اس کے تمام سپنے ایک..... ... ... ایک کر کے بکھر جاتے سپنوں کے اس سنورنے اور بکھرنے کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز سے تیز تر ہوتی گئیں اور اس کے سجنے اور سنورنے کا وقفہ بھی جلد جلد آنے لگا۔ کبھی کبھی تو وہ ہر ہفتہ تماشہ بننے پر مجبور کی جاتی ——— تماشائی آتے، کھاتے پیتے اور مسکراتے ہوئے چلے جاتے لیکن جاتے جاتے اس کے دل پر وار لگا جاتے۔

کوئی کہتا:——

"سب کچھ تو ٹھیک ہے مگر لڑکی کا قد چھوٹا ہے۔"

کوئی کہتا :——

"لڑکی کا نقشہ تو بہت اچھا ہے مگر چارم نہیں ہے!"

کہیں سے کوئی آواز ابھرتی :——

"لڑکی دبلی بہت ہے"

اور بعد میں تو لوگ یہ بھی کہنے لگے کہ :——

"لڑکی کی عمر بہت زیادہ ہے"

غرض ہر تماشائی ایک وار لگا جاتا —— کسی نے بھی تو یہ نہیں سوچا کہ اس ننھے سے دل پر کتنے وار لگ چکے ہیں اور اب جب کہ اس نے اپنی عمر کے پینتیس ۳۵ سال گذار لئے ہیں اور تماشہ بنتے بنتے تھک چکی ہے تو اسے اپنی حماقت پر افسوس ہو رہا ہے —— کاش! اس نے بہت پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا ہوتا۔ کیا ہوتا اس کی شادی نہیں ہوتی، لیکن اس طرح بے حساب زخم تو اس کے ننھے سے کلیجہ کو چھلنی نہ کرتے ——

آج صبح سے ہی اس کے گھر والے بضد تھے کہ ایک بار صرف ایک بار وہ تماشہ بن جائے لیکن وہ بھی اپنی ضد پر اٹل تھی۔ اب وہ ایک بار بھی دلہن بن کر خود کو مذاق کا موضوع بنانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ہر بار کی طرح اس بار بھی ناکامی اس کا منھ چڑائے گی۔ لہٰذا وہ اپنی ضد پر قائم رہی —— لوگ آئے اور اس کو دیکھے بغیر ہی چلے گئے ——

مہمانوں کے جانے کے بعد اس کے گھر والے ایٹم بم کی طرح اس پر پھٹ پڑے۔ اس کے بوڑھے والد نے بڑی بے رحمی سے اسے کمرے سے گھسیٹتے ہوئے آنگن میں لا پٹکا اور دو چار زبردست تھپڑ اس کے رخسار پر لگاتے ہوئے بربرانے لگے:۔

"کمبخت ضدی لڑکی! اب رہ عمر بھر کنواری، کتنی اچھی منسوب تھی، لیکن کمبخت کی ضد نے سب چوپٹ کر دیا۔"

گھر کے دیگر افراد بھی کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

رات گہری ہو چلی تھی، سارا سنسار سو یا پڑا تھا، لیکن.... ..... وہ جاگ رہی تھی..... اس کے دل کا ہر زخم جاگ اٹھا تھا اور وہ سسکیوں کے درمیان سوچ رہی تھی:۔

"اب تک تو اس نے غیروں سے ہی غم کھائے تھے لیکن آج.... ..... آج تو اپنے بھی پرائے ہو گئے ہیں۔"

••

۲۴ دسمبر ۱۹۷۹ء

ممتا کی خوشبو

گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنا بستہ ٹیبل پر پٹکا اور زور سے چلائی ——

"ممی..... ... او..... ... ممی ڈیئر..... ... ..."

بے بی کی آواز سن کر بوا جو باورچی خانہ میں کوئی کام کر رہی تھیں ہربڑا کر باہر آئیں اور لگیں بے بی کو نصیحت کرنے ——

"دیکھو بٹیا! کتنی بار منع کیا ہے کہ اس طرح اچھے بچے کان پھاڑ کر چیخا نہیں کرتے ہیں، پھر تم تو جانتی ہو کہ ممی اس وقت گھر میں نہیں رہتی ہیں۔ پھر "ممی ممی" کی رٹ کیا لگا رکھی ہے تم نے ——؟"

—— یہ کہہ کر بوا باورچی خانہ میں پلٹیں اور نعمت خانہ میں سے کھانے کی سجی ہوئی پلیٹ نکال کر بے بی کے سامنے رکھتے ہوئے بولیں، ——

"ممی نے کہا ہے کہ کھانا کھا کر کہیں باہر جانا۔"

بے بی جو اسکول سے بے حد خوش گھر آئی تھی لیکن گھر میں ممی کو نہ پا کر اس کا منہ لٹک گیا۔ اس کی آئی ہوئی بھوک ختم ہو گئی اور سامنے کھانے کی پلیٹ دیکھ کر بھی اس کا دل کھانا کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا، اس نے خموشی سے پلیٹ اٹھائی اور دوبارہ نعمت خانہ میں رکھ دیا ——— بوا پھر سے اپنے کام میں لگ چکی تھیں، انھوں نے دھیان بھی نہیں دیا اور بے بی چپ چاپ اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گئی ——— آج اسکول میں وہ بے حد خوش تھی، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جلدی سے چھٹی ہو اور گھر جا کر وہ ماں سے لپٹ جائے اور اسے یہ خوشخبری سنائے کہ وہ اپنے کلاس میں فرسٹ ہوئی ہے۔ لیکن گھر پہونچ کر اس کی ساری مسرت ہوا ہو گئی، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دوڑتے دوڑتے کہیں ٹھیس لگی اور وہ اچانک زمین پر گر پڑی ہو، ———

——— اور یہاں تو کوئی اٹھانے والا بھی نہیں ہے، کوئی یہ پوچھنے والا بھی نہیں ہے کہ: ———

"بے بی! تم کیوں اداس ہو گئیں ——— ؟ تمھاری تیز آواز اچانک کہاں کھو گئی ——— ؟؟ تم تو ننھی بچی کی طرح چہک رہی تھیں، یہ اچانک تم اتنی سنجیدہ، اتنی گمبھیر کیونکر ہو گئیں ——— ؟؟؟"

ایک بوا ہیں جو اب اتنی بوڑھی ہو چکی ہیں کہ جو کچھ وہ

کرلیتی ہیں، وہی غنیمت ہے، انھیں اتنی فرصت، اتنی سمجھ کہاں کہ وہ بے بی کے جذبات کے اتار چڑھاؤ کو سمجھ سکیں۔ اور ... ... پھر... ... ... وہ تو... ... ... بوا ہیں۔ جب مستی ان باتوں کو نہیں سمجھ پاتی ہیں تو بوا سے تو شکایت ہی فضول ہے ——"

بے بی جو اب بے بی نہیں، گیارہ سال کی ہوشمند بچّی تھی، طرح طرح کے احساسات میں الجھتی رہی، بستر پر جاکر بھی اسے سکون نہیں ملا —— تو وہ پھر باہر نکل آئی —— گھر میں ہر طرف سنّاٹا تھا۔ صرف کچن روم سے بُوا کے برتن مانجھنے کی آواز بار بار آرہی تھی، ساتھ ہی نل سے پانی کے گرنے کی ٹپ ٹپ آواز... —— ... اور یہی چیزیں گھر کے اس پرسکوت ماحول میں زندگی کی علامت پیش کر رہی تھیں —— ورنہ اس گھر میں اس وقت زندگی اور زندہ دلی نام کی اور کوئی چیز نہ تھی —— بے بی کی طبیعت اس پرسکوت ماحول سے گھبرانے لگی تو وہ دل بہلانے کی خاطر اپنی سہیلی رکمنی کے گھر چلی گئی —— رکمنی کھانا کھا کر ابھی ہاتھ ہی دھو رہی تھی ——

اس کی ماں جاڑے کی ڈھلتی دھوپ میں بیٹھی رکمنی کی چھوٹی بہن کے سر میں کنگھا کر رہی تھیں، رکمنی کو کھانے سے فارغ ہوتے دیکھ کر بولیں:

"آ بیٹی، تیرے بھی سر میں تیل ڈال دوں۔ کیسے ہو رہے ہیں تیرے بال ——"

بے بی جو یہ سوچ کر گئی تھی کہ تھوڑی دیر رکمنی کے ساتھ کیرم کھیل کر وقت گذارا جائیگا ـــــ لیکن رکمنی کو ماں کے قریب جاتے دیکھ کر وہ اپنی خواہش دل ہی میں چھپائے رہ گئی' اور اداس نظروں سے رکمنی اور اس کی ماں کو دیکھنے لگی ـــــ اچانک اسے خیال آیا کہ اس کے بھی تو بال خشک ہو رہے ہیں۔ لیکن کون ہے جو اس کے سر میں اس قدر پیار سے تیل مالش کرے۔؟ اس کی ماں کو تو فرصت ہی کہاں رہتی ہے ـــــ وہ بے چاری تو اسے ناشتہ اور ٹفن ہی مشکل سے دے پاتی ہیں' ـــــ ایک لمحہ کے لئے اسے اپنی ماں کی مجبوری پر ترس آیا' لیکن دوسرے ہی لمحہ یہ خیال ذہن کے کسی تاریک گوشہ سے اُبھرا ـــــ

"وہ بے کار ہی پیدا ہوئی ایسے گھر میں ـــــ" اس سوچ نے اسے اور بھی مضمحل بنا دیا ـــــ رکمنی کی ماں نے اسے مغموم دیکھ کر سوال کیا :ـــــ

"کیوں بے بی' ابھی تک ماں نہیں آئی ہیں ـــــ؟"

"نہیں چاچی" مختصر سا جواب دے کر وہ نہایت بے دلی کے ساتھ وہاں سے واپس لوٹ آئی ـــــ

اپنے گھر میں پہنچ کر پھر وہی خاموشی اور دَم گھُٹا دینے والی فضا اسے اپنے چاروں طرف محسوس ہوئی ـــــ رکمنی کے گھر جا کر اس کے دل کا بوجھ کم ہونے کے بجائے اور بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آکر دوبارہ بستر پر لیٹ گئی اور اپنے دلی اضطراب کو کم کرنے کے لئے میز پر سے میگزین اٹھا کر اُلٹ پلٹ کرنے لگی۔

لیکن چنچل دل ابھی مطالعہ میں بھی نہیں لگ رہا تھا ـــــ اس نے ٹک ٹک کرتی ہوئی وال کلاک کی طرف دیکھا ـــــ

"ابھی تو پونے چار ہوئے ہیں، ممی کے آنے میں ابھی سوا گھنٹہ باقی ہے۔ اور پاپا بھی تو چھ سے پہلے شاید ہی آتے ہیں ـــــ"

اس نے افسردہ لہجہ میں بُوا کو آواز دی: ـــــ

"بُوا میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ ذرا میرا سر داب دیجئے۔"

لیکن بُوا کو کام ختم کرنے کی عجلت تھی ـــــ "اچھا بیٹا، آتی ہوں" کہہ کر جلدی جلدی اپنا کام پورا کرنے لگیں۔

بے بی پھر یادوں کے جزیرے میں کھو گئی ـــــ اسے عہدِ طفلی کے چھوٹے چھوٹے واقعات یاد آنے لگے ـــــ

ممی کہتی ہیں کہ میں بچپن میں انھیں چھوڑنا بالکل پسند نہیں کرتی تھی ـــــ ان کا کالج جانا بھی دشوار تھا ـــــ کالج جانے سے قبل وہ گھنٹوں مجھ سے علیحدہ ہونے کے لئے پینترے بناتی رہتیں ـــــ کبھی رکشا آنے سے قبل ہی مجھے بُوا کے شامل دکان پر ٹافیاں خریدنے کے واسطے بھیج دیتیں ـــــ یا بسا اوقات پاپا گود میں لے کر ڈرائنگ روم میں چلے جاتے اور کبھی کبھی اگر وقت نہیں رہا تو وہ مجھے روتی چلاتی ہی چھوڑ کر چلی جاتیں ـــــ میں دیر تک پیر پٹک پٹک کر رویا کرتی اور اپنی چیخ سے پورے گھر کو ہنگامۂ محشر کا نمونہ بنا دیتی ـــــ کبھی غصہ میں دودھ کی بوتل توڑ دیتی اور بسا اوقات بُوا کی چمکار پر انھیں اپنے ننھے دانتوں سے گھائل کر دیتی۔ میری ان شیطانی حرکتوں پر کبھی کبھی پاپا ڈانٹتے اور کبھی بُوا جھنجھلاتیں۔

—— لیکن اس وقت میری مسرت کی کوئی سیما نہیں ہوتی جب ممی کا قدم گھر میں داخل ہوتا —— میں تالیاں بجا بجا کر، جھوم جھوم کر ان کا استقبال کرتی تھی ——،

ایامِ طفلی کی بھولی بسری باتوں کی بازیافت کرتے کرتے نہ جانے کب اس کی آنکھیں لگ چکی تھیں ——،

—— اچانک کچن روم سے آتی ہوئی ممی کی آواز نے اسے بیدار کر دیا —— ممی غریب بوُا پر شعلہ بار تھیں :—

"بوُا، آپ دن بھر کیا کرتی رہیں —؟ بے بی نے کھانا بھی نہیں کھایا اور آپ نے دھیان نہیں دیا —؟؟ —— میں آپ کو ماں بہن سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں اور آپ ہیں کہ میرے بچہ کا خیال تک نہیں رکھتیں —— مجھے اپنے لئے کچھ نہیں چاہئے —— کچھ نہیں چاہئے، لیکن کم از کم میرے بچہ کا تو..... ....."

ممی غم و غصہ سے تلملا رہی تھیں، ان کی آواز میں بیچارگی اور محبت سبھی کچھ سمٹا ہوا تھا ——

—— بے بی کہ خواہش ہوئی کہ وہ دوڑتی ہوئی جائے اور ممی کے گلے میں پیار سے باہیں ڈال کر انھیں یہ بتا دے :—

"میری پیاری ممی! قصور بوُا کا نہیں، آپ کی اپنی بیٹی کا ہے جس کا دل اس گھر میں بوُا کو نہیں، آپ کو ڈھونڈتا ہے —!!"

●●

ماہنامہ "بانو" مارچ ۷۷ء

ڈوبتا سورج

گلابی سردی کی رات تھی ۔ رات کے کوئی بارہ بج رہے ہوں گے ۔ میں نے اپنی نوٹ بک بند کی اور کمرے کی بتی بجھا کر ابھی اپنے بیڈ پر آیا ہی تھا کہ اچانک رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک دلخراش چیخ سنائی دی ——— میں ہڑبڑا کر بستر سے نکل کھڑا ہوا ——— لائٹ آن کی اور بیڈ روم کا دروازہ کھول کر بالکونی پر جا کھڑا ہوا ——— نیچے بجلی کے کھمبے کی زرد روشنی میں گلی کے موڑ پر دو سائے آپس میں گتھے ہوئے نظر آئے ۔ ان میں سے ایک اوپر تھا اور دوسرا نیچے اور دونوں کی حلق سے کتے کی طرح "غوں، غوں" کی آوازیں نکل رہی تھیں ———

——— معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا، لیکن بے اختیارانہ میں سیڑھیوں کو تقریباً پھلانگتا ہوا نیچے اتر آیا ——— گلی

کے موڑ پر پہونچ کر میں زور سے چیخا :——

"کون ہو تم لوگ اور کیا کر رہے ہو ——؟"

میری آواز سن کر دونوں سائے الگ ہو گئے۔ ان دونوں کے الگ ہوتے ہی بے اختیار میری زبان سے نکلا :——

"ارے آپ، شرما جی ——؟"

ان کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے یقیناً بڑا دکھ ہوا۔ —— شرما جی تو اپنے محلہ کے ہی آدمی تھے اور سوسائٹی میں اچھے نام سے جانے جاتے تھے لیکن ان کی ایسی حالت.....

میں ابھی کچھ پوچھنے ہی جا رہا تھا کہ شرما جی غرائے :۔

"ابے شالہ ! تم بھی آ گیا اپنے قرضہ مانگنے، جاؤ، جاؤ میں کسی کو نہیں دوں گا —— تم سب بدمعاش ہو ——"

شرما جی پاگلوں کی طرح بک رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ انھیں ہو کیا گیا ہے —— کیا یہ مجھے نہیں پہچان رہے ہیں ——؟ میں نے اس آدمی کی طرف دیکھا جو بجلی کے کھمبے سے لگا اپنے کپڑے کی گرد جھاڑ رہا تھا —— اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر کہا :——

"حجور ! یہ کھود (خود) بدمعاش اور گنڈے (غنڈے) ہیں، اس لئے انھیں ہر آدمی بدمعاش اور گنڈا

نظر آتا ہے۔ شراب کے نشے میں پاگل ہو رہے ہیں ـــــ اچھا
آج بھی میں ان کا نشہ اتار ہی دم لوں گا ـــــ"

یہ کہہ کر وہ پھر ان سے الجھنا چاہتا تھا کہ میں نے منع کیا:۔
"ارے نہیں بھئی! یہ ایک شریف آدمی ہیں۔ میں انھیں
جانتا ہوں۔ یہ ہمارے محلہ میں ہی رہتے ہیں، تم نے ان
کی یہ کیا گت بنا دی ہے ـــــ؟

"حجور! میں نے کچھ نہیں بنایا ہے۔ انھوں نے خود اپنی
یہ گت بنائی ہے ـــــ آپ نہیں جانتے یہ ہر روز پیتے
ہیں اور اسی طرح بَرَبَراتے ہیں ـــــ؟

اتنا سننا تھا کہ شرما جی نے خونخوار نظروں سے اس
کی طرف دیکھا اور لگے گالیاں بکنے:ـــــ

"شالہ! میں پیتا ہوں تو کیا تیرے باپ کا پیتا
ہوں!! تو کون ہوتا ہے مجھے ٹوکنے والا ـــــ"

"مجھے تمھیں روکنے اور ٹوکنے سے کیا فائدہ، میں تو صرف
اپنا پیسہ چاہتا ہوں پیسہ..... ....."

اس آدمی نے قدرے تیز آواز میں کہا ـــــ پھر
اس نے مجھے بتایا کہ:ـــــ

"حجور! آج سے تقریباً چھ ماہ پہلے انھوں نے مجھ سے
تین سو روپئے قرض لئے تھے اور کہا تھا کہ ـــــ

"بس پہلی تاریخ کو سارے قرضے اتار دوں گا" ـــــ
ـــــ لیکن نہ جانے کتنی پہلی تاریخ آئی اور چلی گئی اور یہ حجرت

(حضرت) ہر پہلی کو آنے والی پہلی تاریخ پر ٹالتے رہے ——
—— لیکن اب میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ شرافت سے پیسہ
دینے والے نہیں ہیں۔ اس لئے آج مجبور ہو کر میں نے یہ
حرکت کی ہے —— ان کے پاس شراب پینے کے لئے
پیسہ ہے لیکن ایک گریب (غریب) کا قرضہ اتارنے کے لئے
پیسہ نہیں ہے —— اس نے بڑی حقارت سے ان کی
طرف دیکھتے ہوئے کہا ——
میں نے ہمدردی سے اس شخص کی طرف دیکھا
جو یقیناً خستہ حال لگ رہا تھا اور اسے تسلی دیتے ہوئے
سمجھایا :——
"اچھا بھیا! آج معاف کر دو، میں تمہارا پیسہ بہت
جلد دلوا دوں گا ——"
میرے کہنے پر وہ شخص مطمئن ہوا اور تشکر بھرے
لہجہ میں بولا :——
"خدا بھلا کرے آپ کا —— میرا ڈوبا ہوا پیسہ
نکل گیا تو میں آپ کا بڑا احسان مند ہوں گا ——"
یہ کہہ کر وہ ایک طرف چل دیا اور میں شرما جی
کو اپنے ساتھ لے کر ان کے گھر کے دروازے تک
چھوڑ آیا —— ان کے بیڈ روم کی بتی جل رہی تھی ——
—— شاید ان کی پتنی اب تک ان کے انتظار میں
جاگ رہی تھیں ——

میں انھیں دروازہ پر چھوڑ کر پلٹ آیا ——
اپنے بستر پر گیا تو کئی رات تک مجھے نیند نہیں آئی ——
—— رہ رہ کر شرما جی کی صورت میری آنکھوں میں گھوم جاتی —— شرما جی دن کے اجالے میں کتنے بھلے آدمی لگتے ہیں، انھیں دیکھنے سے ایسا لگتا ہی نہیں کہ وہ غلط سوسائٹی میں رہتے ہیں۔ لیکن رات نشہ کی حالت میں تو وہ سچ میں غنڈہ لگ رہے تھے —— خونخوار بھیانک آنکھیں، منھ سے بدبو کی بھبھک، قدم میں لڑکھڑاہٹ کیسی وحشت ناک تھی اس وقت ان کی صورت، ——
—— حقیقت میں شراب کتنی بری چیز ہے۔ شراب کے نشہ میں اچھا بھلا آدمی بھی کیسی کیسی حرکتیں کر جاتا ہے۔
—— اچھا ہے کہ ہمارے مذہب میں شراب کو حرام قرار دیا گیا ہے —— لیکن شرما جی کو یہ عادت لگی کہاں سے —— ؟ —— یقیناً غلط سوسائٹی نے انھیں برباد کیا ہے ورنہ —— آج سے چند سال پہلے تو وہ ایک بھلے آدمی تصور کئے جاتے تھے ——
انھیں خیالات میں الجھتے الجھتے میری آنکھ لگ گئی ——
—— صبح دیر سے نیند کھلی —— اٹھنے کے ساتھ آفس جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا ——
مجھے شرما جی سے بھی ملنا تھا۔ میں نے سوچا اب شام میں آفس سے واپسی پر ہی ان سے ملوں گا اور —— اس

آدمی کا قرضہ اتارنے کا مشورہ دوں گا ——

شام میں حسب پروگرام میں، ان کے ڈیرہ کی طرف چلا گیا —— ان کی پتنی باہر صحن میں پھولوں کی کیاریوں میں پانی ڈال رہی تھیں —— میں انھیں دیکھ کر سوچنے لگا: ——

"کیسی ہے یہ عورت —— ؟ اپنی زندگی کی پھلواری کو تو سجا نہیں پائی، اس باہری پھلواری کو سجانے سے کیا حاصل ؟"

میں نے لوہے کے گیٹ کی کنڈی کھولی اور اندر داخل ہو گیا۔ کنڈی کھلنے کی آواز سن کر وہ پیچھے کی طرف مڑیں، مجھے دیکھتے ہی پہچان گئیں ——

"ارے ارشاد صاحب آپ —— ؟ کہئے اتنے دنوں بعد کیسے آنا ہوا —— ؟؟"

"ہاں ذرا اطہر ماجی سے ایک کام ہے، کہاں ہیں وہ ؟"

"وہ تو سوئے ہوئے ہیں ——"

"اس وقت —— ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے، جو شخص سونے کے وقت میں جاگتا ہو، وہ جاگنے کے وقت میں سوئے گا نہیں تو اور کیا کرے گا —— ؟"

ان کے لہجے کے طنز کو محسوس کرتے ہوئے میں نے کہا: ——

"آپ انھیں سمجھاتی کیوں نہیں ہیں ——— ؟"

"وہ کسی کی سنتے ہی کب ہیں ——— ؟"

میں نے رات والا واقعہ انھیں سنایا تو وہ مغموم لہجہ میں گویا ہوئیں :———

"ایسا واقعہ تو بارہا پیش آچکا ہے ارشاد صاحب ! اور قرض کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے ——— پہلی تاریخ آتے ہی مشاہرے کی رقم قرضہ خواہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اس کے بعد سارا ماہ میں اور میرے بچے کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں یہ کوئی ہم لوگوں کے دل سے پوچھے ——— دیکھئے نا ان کی صحت بھی کیسی برباد ہو گئی ہے ۔ ابھی پچھلے ماہ میں نے اپنے زیورات بیچ کر ان کا علاج کرایا تھا ——— ڈاکٹر شراب نوشی کو منع کرتے ہیں مگر یہ مانیں جب تو ——— اب تو میں بھی تنگ آچکی ہوں ——— بچوں پر بھی کتنا خراب اثر پڑتا ہے لیکن ان کو تو کسی بات کا خیال ہی نہیں رہا ———"

مسز شرما کے چہرے پر پریشانی اور فکر کی ان گنت لکیریں ابھر آئیں ——— انھیں اداس دیکھ کر میں بھی مضمحل ہو گیا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی گفتگو کرنے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے وقت انھوں نے کہا ———

"ٹھیک ہے اس ماہ کی پہلی تاریخ کو آپ ہی مجھ سے روپیہ لے کر اس آدمی کو دے دیجئے گا اور آئندہ کچھ دینے کے

نے منع کر دیجیے گا ——— "

کئی ماہ بیت گئے ——— ایک صبح میں آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ شرما جی کا لڑکا گھبرایا ہوا آیا :—

" چاچا جی ! ماں نے آپ کو جلدی سے بلایا ہے۔ پاپا کی طبیعت بہت خراب ہے ——— "

میں فوراً اس کے ساتھ ہو لیا ——— ان کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ شرما جی نے رات بھر بہت پی لی ہے ——— بہت زیادہ پی لینے کی وجہ سے ہوش و حواس کھو کر ساری رات شہر کے بڑے نالہ کے قریب پڑے رہ گئے۔ جاڑے کی سرد رات تھی اس لئے سردی شدید طور پر لگ گئی ہے۔ وہ تو صبح میں کسی بھلے آدمی کی نظر ان پر پڑی اور ان کی جیب سے گھر کا پتہ معلوم ہوا تو وہ انھیں گھر تک پہنچا گیا ہے۔

شرما جی ابھی تک ہوش میں نہیں آئے تھے۔ ان کی بیوی کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ پریشان لہجہ میں بولیں :———

" ارشاد صاحب ! جلدی سے کسی اچھے ڈاکٹر کو بلائیے اور انھیں بچا لیجیے۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا ——— "

میں ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا ——— لیکن جب ڈاکٹر پہنچا تو شرما جی ہمیشہ کے لئے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ میں نے آخری بار ان کا چہرہ دیکھا تو مجھے ان کی حالت پر بڑا ترس آیا۔

لیکن دوسرے ہی لمحہ ذہن نے سوچا :—

"ایسے آدمی کا مرجانا ہی اچھا ہوا۔ یہ زندہ رہتے بھی تو کیا کرتے۔ ان کی حالت تو اس ڈوبتے سورج کی سی تھی جو اپنے ساتھ تاریکی کا پیغام لاتا ہے۔"

●●

بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ بھاگلپور

جنّت بھی جہنّم بھی

گاڑی پوری رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی ـــــــ
ـــــــ لیکن اس کا ذہن ایک ہی مقام پر ٹھہرا ہوا تھا ـــــــ
ـــــــ وہ مقام تھا اس کا گھر ـــــــ ایک
خوبصورت اور چھوٹا سا گھر ـــــــ وہ ارد گرد کے
ماحول سے بے خبر اپنے اس خوبصورت سے گھریلو ماحول
میں کھوئی ہوئی تھی جسے چھوڑ کر وہ ابھی ابھی آئی تھی..... .....
.... کتنا خوبصورت ماحول ہے اس کے گھر کا ـــــــ
ـــــــ کس قدر پیار کرنے والے ہیں اس کے شوہر اور کتنا
پیارا اور ذہین ہے اس کا بچہ ـــــــ اس بچہ کو اپنے
سے علیحدہ کرتے وقت اس کی ممتا تڑپ اٹھی تھی ـــــــ
ـــــــ لیکن ـــــــ اپنے بچہ کا مستقبل بنانے
کے لئے اسے اس کڑے درد کو بھی سہنا ہی تھا ـــــــ

—— وہ بڑے جذباتی انداز میں اپنے اکلوتے بچہ کو یاد کرنے لگی اگرچہ اب اس کا بچہ، بچہ کہلانے کا مستحق نہیں رہا کیوں کہ اب وہ پورے بارہ سال کا ہو چکا تھا لیکن ایک ماں کی نظر میں تو بچہ ہمیشہ بچہ ہی رہتا ہے، وہ بھی اس ماں کی نظر میں جو اپنے بچہ سے دور رہتی ہو —— اسے اپنی زندگی بڑی تشنہ معلوم ہوتی ہے ٹھیک اس ندی کی مانند جو پانی کی کمی سے ندی کہلانے کی مستحق بھی نہ ہو —— کبھی کبھی اسے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ بھی عورت کہلانے کی حقدار نہیں ہے —— عورت تو ایک خوب صورت گھر کی مالک ہوتی ہے جہاں اس کا شوہر دن بھر کی تھکن کے بعد گھر لوٹتا ہو تو سرمئی شام کے اجالے میں اپنی بیوی کو اپنا منتظر پاتا ہو، لیکن اس کا شوہر کتنا بدنصیب ہے —— اس کی بیوی اپنے دل میں پیار کا سمندر چھپائے ہوئے اس سے اس قدر دور ہے کہ بیوی کا پیار اس کے لئے ایک سہانا خواب ہی تو ہے۔

اس کا ذہن چلتے ہوئے پروجکٹر کی طرح تیزی سے گھوم رہا تھا اور ذہن کے پردے پر تصویریں بدلتی جا رہی تھیں —— اسے فرصت کے وہ خوبصورت روز و شب یاد آنے لگے جب کالج میں تعطیل شروع ہوتے ہی وہ اگلی ٹرین سے ہی اپنے شوہر اور بچہ کے پاس جانے کے لئے اپنا ٹکٹ بک کرا لیتی ہے ——

—— لیکن یہ لمحے کتنے گریز پا ہیں —— کاش! وہ ان اڑتے ہوئے لمحوں کو اپنے خوب صورت آنچل میں باندھ سکتی ہے۔

—— !

کبھی کبھی اسے اپنے اوپر بڑا غصہ آتا ہے۔ کیا ضرورت تھی اسے نوکری کرنے کی —— مانا کہ اس کا شوہر ایک ادنیٰ مشاہرہ پانے والا ملازم ہے لیکن دنیا میں کتنے مرد اس کی طرح ہیں، جو اسی قلیل مشاہرہ میں بیوی بچوں کا گذارہ کر ہی لیتے ہیں۔

خواہشات کی رنگین تتلیوں کو پکڑنے کی آرزو ہی تو آج کی زندگی کا المیہ بن چکی ہے ——، نہ جانے کتنی دفعہ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ وہ اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیکر اپنے شوہر اور بچہ کے قریب جا کر ذہنی اور قلبی یکسوئی حاصل کرے —— لیکن جب جب اس نے اس ارادے پر عمل کرنا چاہا تو نہ معلوم وہ کون سی ان دیکھی طاقت تھی جو اسے ایسا کرنے سے روک دیتی اور اس وقت وہ سوچتی رہ جاتی کہ یہ نوکری بھی کیا خوبصورت بلا ہے —— بندگی میں بے چارگی اور بیچارگی میں خود مختاری کا مزہ اس نے نوکری کر کے ہی پہچانا تھا۔

اچانک ٹرین ایک دھچکے کے ساتھ رکی اور بہت ساری تیز آوازیں اس کے ذہن کے "پردہ جھکڑ" پر ضرب لگانے لگیں —— اس نے کھڑکی سے سر نکال کر ایک چائے والے کو آواز دی جو گاڑی کے پلیٹ فارم پر رکتے

ہی تیز تیز قدموں سے ادھر ادھر دوڑنے لگا تھا۔ اور ——
اپنی رفتار سے بھی زیادہ تیز آواز میں "چائے، چائے" کی
الاپ سنا رہا تھا —— چھوٹی سی مٹی کی پیالی میں
اس نے ایک کپ چائے خریدی اور ہولے ہولے چسکیاں
لینے لگی —— اس وقت اس معمولی قسم کی چائے میں بھی اسے
بڑا کیف مل رہا تھا اور اس کے نڈھال جسم کو راحت مل رہی
تھی —— وہ چائے ختم کرنے کے بعد پلیٹ فارم پر نظریں
جمائے دھیرے دھیرے گنگنانے لگی ؎

ہر در پہ ترے درد کے مارے نہیں جاتے
آنکھوں میں بسے ہیں جو نظارے نہیں جاتے

وہ زیر لب گنگنا رہی تھی اور ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ
فارم پر رینگنے لگی تھی لیکن ڈبے کا شور و غل بڑھ گیا تھا ——
—— بہت سارے نئے چہرے اس ڈبہ میں گھس آئے
تھے اور جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر سرگرداں تھے۔ اس کے
سامنے والی برتھ پر ایک ادھیڑ عمر کے میاں بیوی مع آدھا
درجن بچوں کے براجمان ہو گئے تھے —— مرد بے چارہ کمپارٹمنٹ
میں داخل ہوتے ہی جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑانے
لگا —— بڑے بچوں کو سامان کے ساتھ اوپر کی برتھ پر
بٹھا دیا اور چھوٹے بچے گھنگھرو کی طرح والدین کے پیچھے
لگے ہوئے تھے —— ان میں سے ایک گھنگھرو بھی بجتا تو
تمام گھنگھرو جھنجھنا اٹھتے اور ڈبہ کے اندر ایک "میوزیکل شو" کا

تماشہ بندھ جاتا ـــــ مسافر حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگتے اور دونوں زن و شوہر تھوڑا کھسیاتے، تھوڑا جھنجھلاتے ہوئے اپنے بچوں سے الجھنے لگتے ـــــ

"ابے کیا کر رہا ہے؟"

"ٹھہرو، ٹھہرو، گھر پہنچ کر بتاتا ہوں۔"

"ارے کم بختو ذرا چین تو لینے دو۔"

"جہنم میں جائیں ایسے بچے ـــــ"

"تمھیں بھی تو بہلانے نہیں آتا ـــــ" میاں غصہ ہو کر بیوی سے کہتے اور بیوی جھنجھلا کر میاں سے کہتی:۔

"سارا قصور تمھارا ہی ہے۔ تم نے تو میری زندگی اجیرن کر دی۔"

شروع میں وہ بڑی دل چسپی سے اس تماشے کو دیکھتی رہی ـــــ لیکن کچھ ہی دیر بعد اس ہنگامے سے اسکی طبیعت اُوب سی گئی ـــــ اس کی اس بے زاری کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک چلبلے نوجوان نے سرگوشی کے انداز میں کہا:۔

"شاید ایسے ہی ہنگامے سے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے کہ ع

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق"

وہ مسکرانے لگی ـــــ مگر اس عورت کو دیکھ کر اسے بڑا ترس آنے لگا تھا جو اپنے آنچل اور کپڑوں سے بے

خبر اپنے بچوں کے ساتھ الجھی ہوئی تھی ـــــ وہ سوچنے لگی:...
"کیا زندگی کا کوئی روپ مکمل نہیں ـــــ ایک...
وہ ہے جو احساسِ تنہائی سے جل رہی ہے ایک وہ ہے...
پھول جیسے بچوں کو جہنم میں ڈال رہی ہے۔

••

بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ بھ...

کہانی ایک مزارگی

جب میں پہلی بار اس راستہ سے ہو کر گذر رہی تھی تو مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا تھا کہ ایک ٹوٹے پھوٹے مزار کے گرد بہت سارے سفید پوش حضرات کے سر بڑے ادب سے زمیں بوس تھے۔ طاق میں اگر بتیاں جل رہی تھیں اور ان کی خوشبو دور دور تک پھیل رہی تھی۔ چند مرجھائے ہوئے پھول بھی مزار پر ڈالی ہوئی گلابی چادر کے دامن میں بکھرے ہوئے تھے۔ میں انھیں دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے سوچتی رہ گئی تھی ؏

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

پھر یہ میرا روز کا معمول بن گیا تھا کہ میں اس راہ سے ہو کر گزر جاتی ـــــ ہر روز میں دیکھتی کہ کچھ لوگ بڑے ادب سے دوزانو

بیٹھ کر پیر بابا کے حضور میں دستِ کشکول اٹھائے رہتے۔ اور ان کے لب لب آہستہ آہستہ ہلتے رہتے ——— مجھے حیرت تو اس بات پہ تھی کہ ان مزار پرستوں میں ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔

مزار تھا بھی ایسی جگہ کہ جہاں پہنچنے کیلئے کسی طرح کی قید و بند نہیں تھی، عموماً بعض مزار کو بھی لوگ اپنی جاگیر بنا لیتے ہیں اور وہ ان کی روزی روٹی سے اس طرح منسلک ہو جاتے ہیں کہ ہر شخص آزادی سے وہاں تک پہنچ بھی نہیں پاتا ہے لیکن یہ مزار اپنی نوعیت کا ایک الگ مزار تھا ——— ٹھیک چوراہے پر، سڑک سے ذرا پرے، قدرے اونچائی پر ایک شکستہ حال قبر ——— لیکن اس ظاہری شکستہ حالی کے اندر وہ قوت پنہاں تھی کہ ہر کس و ناکس اپنی مرادیں پوری کروانے کے لئے وہاں جا کر، بیچ سڑک پر ——— گرد و نواح سے بیخبر، چلچلاتی دھوپ میں کھڑے ہو کر گھنٹوں گڑگڑاتا رہتا۔ میں جب وہاں سے گذرتی تو اس منظر کو دیکھ کر مجھے بے اختیار حضرت شاد کا یہ شعر یاد آجاتا ہے

پچھلے پہر اُٹھ اٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدوں پہ سجدے
جو نہیں جائز اس کی دعائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

مزار کے دوسری طرف، قدرے ہٹ کر کوٹ، کچہری، بینک اور بہت سارے سرکاری دفاتر تھے۔ اس طرح آدمیوں کی ہر وقت وہاں پر چہل پہل رہتی تھی ——— شاید اس مزار کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کورٹ، کچہری والوں کو تو ہر روز کوئی نہ کوئی معاملہ رہتا ——— لہٰذا وہ اپنے مسائل کو حل

کرنے سے قبل ایک چکر مزار شریف کے گرد بھی ضرور لگا آتے اور نہایت خشوع کے ساتھ مرادیں اور منتیں مانگتے ..... اور جب ..... ان کی مرادیں پوری ہو جاتیں تو ..... نذرانے کے لئے مٹھائیاں خیرات کے لئے پیسے اور مزار پر چڑھانے کے لئے رنگ برنگی چادریں لاتے..... سب سے دلچسپ بات تو یہ تھی کہ ان چادروں کو دیکھ کر منتیں مانگنے والوں کی حیثیت کا بھی اندازہ ہو جاتا تھا ——

عموماً جمعرات کو وہاں پر اچھی خاصی بھیڑ ہوا کرتی ..... اور شامیں تو وہاں کی ویران ہوتیں لیکن جمعرات کی شام کی رونق ہی کچھ اور ہوتی تھی —— مزار پر آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ اگربتی کے ساتھ ساتھ موم بتیاں بھی جلائی جاتیں ۔ پھولوں کے ساتھ ساتھ پیسے بھی رنگین چادر کے چاروں طرف بکھرے رہتے۔ پانچ پیسہ، دس پیسہ، چونی، اٹھنی ... آسمان کے ستارے کی طرح مزار کی چادر پر چمکتے رہتے —— عموماً سوتی اور کبھی کبھی قیمتی ریشمی چادر جس پر طرح طرح کے نقش و نگار بنے رہتے —— قبر کو ڈھکے رہتیں

جیسے جیسے شام گہری ہوتی جاتی اگربتی کی خوشبو فضا میں پھیلتی جاتی اور مرادیں مانگنے والوں کی بھیڑ بھی بکھرتی جاتی —— آہستہ آہستہ وہاں پر ایک عالمِ سکوت کی کیفیت چھا جاتی —— ان لمحوں میں مجاور چپکے سے اٹھتا اور تمام بکھرے ہوئے پیسوں، مٹھائیوں کے دونوں اور موم بتی و ماچسوں کے ساتھ ساتھ اس خوب

صورت ریشمی چادر کو بھی اٹھا لیتا جو کچھ دیر پہلے مزار کی زینت بنے تھے ـــــ پھر یہ تمام چیزیں ـــــ مجاور کے میلے کچیلے جھولے کی زینت بن جاتیں۔'

یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ ایک سب سے زیادہ متاثر کرنے والی بات یہ تھی کہ مزار کے ٹھیک سامنے لبِ سڑک سائلوں کی ایک لمبی قطار ہوتی جو اپنے لولے، لنگڑے، گندے، کثیف اور زخم خوردہ ہاتھ پیر کا ہر وقت مظاہرہ کرتے رہتے ـــــ مجھے تعجب تو اس بات کا تھا کہ ان مفلوک الحال سائلوں کو نہ تو گرمی لگتی تھی نہ سردی، نہ ان پر برسات کے پانی کا اثر ہوتا تھا اور نہ گرمی کی چلچلاتی جھلستی دھوپ کا ـــــ

کس قدر اطمینان سے وہ سب کے سب اپنی جگہ براجمان رہتے اور جب کوئی سفید پوش مخلوق ان کے قریب سے گزرتی تو ایک مخصوص انداز میں دستِ سوال بڑھا دیتے۔ اکثر راہی تو یوں ہی گزر جاتے اور ان کے ہاتھ کچھ دیر اٹھے رہنے کے بعد خود بہ خود اپنی جگہ پر جا لگتے ـــــ ـــــ لیکن کبھی کوئی اللہ والا دو پیسہ، تین پیسہ یا حد سے حد پانچ پیسہ ایک شانِ بے نیازی سے ان کی طرف پھینکتا ہوا گزر جاتا ـــــ

ان سائلوں میں ایک بہت ہی خستہ حال فقیرنی بھی تھی۔ اس کے بال بہت ہی چھوٹے اور کثیف تھے۔

جس طرح سیاہ کپڑا کثرت استعمال سے بدرنگ ہو جاتا ہے اسی طرح اس کے بال بھی بدرنگ ہو گئے تھے۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی غیر معمولی طور پر دبلے تھے معلوم ہوتا تھا جیسے ہڈیوں کا ڈھانچہ ـــــ لباس کے نام پر صرف ایک میلی سی تہمد اور ایک پھٹا ہوا کرتی نما بلوز ـــــ ان کے علاوہ ایک پرانا، جگہ جگہ سے پچکا ہوا المونیم کا پیالہ اس کے سامنے رکھا رہتا ـــــ یہی تھی اس کی کل کائنات ـــــ میں جب بھی اس بڑھیا کو دیکھتی اس کی عجیب و غریب ہیئت کو دیکھ کر مجھے خدا کی خدائی یاد آجاتی۔

ـــــ

پھر یہ میرا روز کا مشغلہ بن گیا تھا کہ کالج جاتے آتے میں اپنے رکشے ہی پر سے ایک نظر اس بڑھیا کی طرف ڈال لیتی اور دوسری نظر مزار کی طرف ـــــ

بدلتے ہوئے روز و شب کے ساتھ ہر چیز بدل جاتی ہے ـــــ میرے دیکھتے دیکھتے وہ مزار بھی بہت جلد ایک خوبصورت آستانہ بن گیا ـــــ سننے میں آیا کہ کسی رئیس کی منتیں "بابا جی" کی دعاؤں سے پوری ہو گئی ہیں ـــــ

میں نے دیکھا کہ مزدور چلچلاتی دھوپ میں مزار کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں ـــــ چاروں طرف خوبصورت ہشت پہل پائے بنائے گئے ہیں اور ان میں خوبصورت سنگریزے نصب کئے گئے ـــــ اوپر سے مقیش چھت ڈھلی ـــــ نیچے مزار کے چاروں طرف لوہے

کی خوبصورت جالیوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا ـــــ
پھر لوہے کی جالیاں خوشنما رنگوں سے پینٹ (Paint) کی
گئیں ـــــ مزار کے اطراف میں سفیدی پھیری گئی اور
دیکھتے دیکھتے چند ہی روز میں وہ ـــــ شکستہ حال مزار
ـــــ ایک پر شکوہ گنبد نما آستانہ میں مبدل ہو گیا ـــــ
لیکن جب میں نے مزار کے دوسری طرف نظر کی تو دیکھا کہ
وہ بڑھیا ..... ابھی بھی بدستور ..... وہاں پر ننگ دھڑنگ
حالت میں بیٹھی ہوئی ہے ـــــ اور میں سوچتی رہی، دیر تک
سوچتی رہی :ـــ

"کاش! بڑھیا کو بھی کوئی دھنی مل جاتا، جو اس کی
حالت کو ـــ کم سے کم ـــ آدمی کی شکل میں تو بدل دیتا ـــ"

• •

۱۶ اپریل ۱۹۸۲ء

ایک معمہ

وہ میرے سامنے والے فلیٹ میں رہتی تھی۔ اسے اس ایریا میں آئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ یہی کوئی ڈیڑھ دو ماہ ہوئے ہوں گے کہ اسکے شوہر کی بحالی بھی اسی فیکٹری میں ہوگئی تھی جس میں مَیں کام کرتا تھا۔ اس طرح اسکا شوہر اور میں ایک ہی فیکٹری میں ملازم تھے لیکن پھر بھی ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ ایسی بات نہ تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں۔ لیکن پہچانتے ہوئے بھی ایک طرح کی بے تعلقی تھی جو اکثر بڑے شہر کی خصوصیت ہے اس سے ہم لوگ بھی الگ نہ تھے۔

وہ بھی جب آئی تو ایک اجنبی کی طرح۔ شروع میں تو ہم لوگوں نے کوئی خیال نہ کیا۔ لیکن آہستہ آہستہ میری بیوی کو اس عورت سے دلچسپی ہوتی گئی۔ وہ میرے یہاں آتی تھی اور نہ میری بیوی اس کے یہاں جاتی تھی۔ پھر بھی میری بیوی کو اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ بہت خوبصورت ہے اس کی شادی کو دو سال ہوئے ہیں۔ اسے اب تک کوئی بچہ نہیں ہے اور سب سے

افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس عورت کا شوہر بہت بُرے کردار کا آدمی ہے۔
شادی کے کچھ ہی دنوں کے بعد سے وہ اب اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ لیکن
پھر بھی یہ بے چاری اپنے شوہر کو بے پناہ چاہتی ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ
ساری ساری رات اس کا شوہر غائب رہتا ہے لیکن یہ اس کے انتظار میں کروٹیں
بدلتی رہ جاتی ہے۔

ان ساری باتوں کو بتانے کے بعد میری بیوی نے عورتوں کے
مخصوص انداز میں اس عورت کی تقدیر پر ماتم کیا۔

"بے چاری کی قسمت ہی بُری تھی جو ایسے مَرد کے ساتھ بیاہی گئی۔ ورنہ
ایسی خوبصورت عورت کو تو پاکر ہر مرد خوش ہوتا۔"

میں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"تو پھر ایک رات میں اس خوبصورت عورت کو پاکر خوش ہولوں، آپ کو
اعتراض تو نہ ہوگا؟"

میری بیوی نے برجستہ جواب دیا:

"ہم عورتیں آپ مردوں کی طرح تھوڑے ہی بھنورے کی خصلت رکھتی ہیں۔
وہ آپ کو لفٹ ہی نہ دے گی۔

"اجی چھوڑو، بہت دیکھا ہے عورتوں کو!" میں نے عورت ذات کی تحقیر
کرتے ہوئے کہا۔ اس پر میری بیوی نے ایک بیوی کی طرح جرح کیا۔

"یہی تو ہم عورتوں کی حماقت ہے کہ ہم عورتیں خود اپنے قدموں میں زنجیر
ڈال لیتی ہیں، شادی کیا ہوئی کہ بس شوہر کے نام غلامی لکھ دی، عورتوں کی اسی کمزوری
سے مرد فائدہ اٹھاتے ہیں، اگر انھیں ہم عورتوں پر بھروسہ نہ رہے تو پھر وہ اتنے بے
راہ رَو اور بے پروا نہ ہوں۔"

ہم لوگوں میں جرح و تکرار ہو ہی رہی تھی کہ اتنے میں باورچی خانہ سے سالن جلنے کی مہک آئی اور مالتی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کچن روم میں دوڑی۔ پھر میرے بھی فیکٹری جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ نہا دھو کر میں بھی اپنے کام پر چلا گیا۔ شام کو واپس آیا تو نہ جانے کیوں آج میری نگاہ خود بخود شرما جی کے فلیٹ کی طرف اٹھ گئی۔ میں نے دیکھا مسز شرما دریچہ کے قریب بیٹھی کسی کی منتظر ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے ہم دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں اور میں نے محسوس کیا کہ واقعی وہ بیحد خوبصورت عورت ہے۔ میں تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا اپنے فلیٹ میں داخل ہو گیا۔ میری بیوی کسی کام میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے آواز دی اور جب وہ میرے قریب آئی تو میں نے مسٹر شرما کے فلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے! ایک وہ ہیں جو سراپا انتظار ہیں اور ایک آپ ہیں جسے یہ خبر بھی نہیں کہ پتی دیو کب آئے اور کب گئے؟"

وہ اپنے دریچہ سے مسز شرما کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی اور بولی!

"اس بے چاری کو انتظار کے سوا اور کام ہی کیا ہے۔" میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے بیوی کو چھیڑا۔

"ٹھیک ہے تو کل سے میں بھی آپ کو انتظار کراؤں گا۔ تب آپ میری قدر کریں گی۔"

وہ ہنستی ہوئی کچن روم میں چلی گئی اور کچھ دیر میں چائے ناشتہ لیکر حاضر ہوئی۔

ہم لوگوں نے اپنی کرسیاں بالکونی میں نکال لی تھیں جہاں سے مسز شرما ہم دونوں کو بخوبی دیکھ سکتی تھیں۔ کبھی کبھی میں بھی کنکھیوں سے اس طرف دیکھ لیتا اور مجھے محسوس ہوتا، وہ حسرت بھری نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہی ہو۔

میری بیوی نے تو کہہ بھی دیا کہ:
"وہ ہم لوگوں کی خوشگوار لائف کو دیکھ کر رشک کر رہی ہوگی۔" کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اندر چلی گئی اور ہم لوگ بھی اپنے اپنے کام میں لگ گئے لیکن اس دن کے بعد سے میرے دل میں بھی اس عورت کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا اور اپنی بیوی کی طرح میں بھی اس کی بدنصیبی پر افسوس کرتا۔ اب تو ہم لوگوں کا یہ معمول بن گیا تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی کے بارے میں کرید کریں۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی ہم لوگ اپنے کمرے کی بتی بجھا کر اس کی بیقراری کا نظارہ کیا کرتے۔ اکثر تو میں نے دیکھا کہ وہ رات گئے تک بالکونی پر سر جھکائے راہ تک رہی ہے۔ اس کا شوہر برابر ہی دیر سے آتا اور اکثر تو آتا بھی نہیں۔ اس رات وہ ساری رات، کبھی بستر پر لیٹ کر، کبھی کمرے میں ٹہل کر اور کبھی دریچہ پر بیٹھ کر گزار دیتی اور ہم لوگ اپنے روم میں بیٹھے بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ لیتے کیونکہ اس کے بیڈروم کا دریچہ ہمارے بیڈروم کے بالکل سامنے تھا۔

میری بیوی نے ایک دن مجھ سے کہا بھی "آپ شرما جی کو سمجھاتے کیوں نہیں۔ وہ آپ ہی کی فیکٹری میں کام کرتے ہیں، کبھی ان سے کہئے کہ ایک عورت کی زندگی برباد کر کے انھیں کیا ملے گا۔"

میرے بھی دل میں ایک دو بار یہ خیال آیا کہ میں اسے سمجھاؤں لیکن جب میں نے اس کے قریب ہونے کی کوشش کی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آدمی بہت ہی نامعقول ہے، اس سے راہ و رسم بڑھانی فضول ہے، وہ کسی کی کچھ سننے والا نہیں ہے۔ کہیں الٹا وہ کچھ اور ہی مطلب نہ نکال بیٹھے۔ اس لئے میں خاموش رہا۔

کچھ دنوں بعد وہ میرے گھر آنے جانے بھی لگی تھی۔ ایک دن میں شام کو

فیکٹری سے لوٹ رہا تھا تو میرا بیٹا بنٹو شرما جی کے فلیٹ سے نکلتا ہوا تیزی سے آیا اور اپنی توتلی زبان میں بولنے لگا۔

"پپا... پپا... آ... نٹی... نے ہم کو... ٹافی دیا ہے۔" میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور پیار کرتے ہوئے اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

میری بیوی کا موڈ آج صبح ہی سے اچھا نہ تھا۔ کیونکہ وہ لمبی چھٹی پر میکہ جا رہی تھی۔ میں بھی اداس تھا۔ الگ رہنے کی عادت ہم لوگوں کی بالکل ہی نہ تھی لیکن اسے روکتے بھی نہ بنتا تھا کیونکہ اب اس کا پورا ماہ ہو رہا تھا اور یہاں کوئی دیکھنے والا بھی نہ تھا۔ اگر وہ اکیلی رہتی تب بھی کام چل جاتا لیکن بنٹو کو لے کر اور پریشانی تھی۔ وہ تو ابھی خود ہی بہت چھوٹا ہے۔ ماں آجاتی تو سب مشکل حل ہو جاتی لیکن وہ بھی نہ آسکی اس لئے مجبوراً مالتی کو جانے دینا ہی پڑا۔

مالتی کو میکہ پہنچا کر جب میں واپس آیا تو مجھے اپنا فلیٹ اتنا سنسان لگا کہ گھر مجھے کاٹنے دوڑتا تھا' اور میں سوچنے لگا عورت بھی کیا چیز ہے' حقیقت میں گھر کی رونق بیوی بچہ ہی سے ہے۔ اسی وقت مجھے مسز شرما اپنی چھت پر نظر آئیں اور میں سوچنے لگا ایک مسٹر شرما ہے جسے گھر سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ پتہ نہیں وہ کس دل گردے کا مرد ہے؟ مالتی کے چلے جانے کے بعد میری طبیعت بھی گھر میں نہیں لگتی تھی' میں زیادہ تر باہر ہی رہنے لگا۔

ایک دن تیسرے ہی پہر سے مسلسل بارش ہو رہی تھی اس لئے میں کہیں باہر بھی نہ نکل سکا تھا اور نہ کوئی دوست ہی میرے گھر آسکا۔

موسم بے حد خوشگوار تھا۔ جاڑے کی گلابی سردی میں رِم جھم کرتی بارش نے اور بھی رس گھول دیا تھا۔ میں اپنے بستر میں لیٹا ٹرانزسٹر سن رہا تھا کہ اچانک باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک لمحہ کے لئے یہ دیکھ کر

ٹھٹک گیا کہ یہ تو مسز شرما ہیں۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بولیں ـــــ "معاف کریں گے! میں آپ کو کشٹ دینے آئی ہوں۔ دیکھئے نا میرے فلیٹ کی بتی بجھ گئی ہے۔ اندھیرا اتنا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ آپ کے پاس ماچس تو ہوگی؟ مہربانی کر کے دیں، میں ابھی فوراً لوٹا دوں گی۔"

وہ ماچس لے کر چلی گئی تو مجھے خیال آیا کہ ہو نہ ہو اس کے گھر کا فیوز خراب ہو گیا ہو کیونکہ ہم لوگوں کے گھر میں تو بتی ہے۔ یہ سوچ کر میرا دل چاہا میں جا کر اس کے فلیٹ کا فیوز ٹھیک کر دوں، بے چاری اندھیرے میں پریشان ہوگی۔

میں نے باہر سے اپنا فلیٹ بند کیا اور اس کے دروازے پر جا کر دستک دی۔ اس نے ہڑبڑا کر دروازہ کھولا اور اچانک میرے سینہ سے لگ گئی۔ ایک لمحہ کے لئے تو میں بھونچکا رہ گیا، لیکن دوسرے ہی لمحہ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں کس کر بھینچ لیا۔ میں نے محسوس کیا اس ٹھنڈے موسم میں بھی وہ اتنی گرم ہو رہی تھی کہ میرا سارا وجود ایک ہی لمحہ میں گرما گیا۔ اسی لمحہ اچانک لائٹ آگئی اور وہ گھبرا کر میری بانہوں سے الگ ہو گئی۔

کچھ دور جا کر وہ مجھے غصہ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور سارے بدن سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ سراپا آگ بنی ہوئی ہے، میں نے چاہا کہ اس سے ہمدردی کے دو بول کہوں لیکن وہ تو مجھ سے برہم تھی۔ "آپ..... آپ نے مجھے دھوکا دیا..... میں نے تو آپ کو اپنا پتی سمجھا لیکن آپ کو کیا غلط فہمی ہوئی؟ آپ مجرم ہیں..... آپ پاپی ہیں!" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نہ جانے یہ آنسو اپنی کمزوری پر تھے یا اپنی بے چارگی پر۔ میں کچھ دیر تک اسے ہکا بکا دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ لیکن

اس وقت مجھے اپنی بیوی کی وہ بات یاد آ رہی تھی کہ وہ آپ کو لفٹ ہی نہ دیگی۔
—— وہ آپ کو لفٹ ہی نہ دے گی۔ میں سوچنے لگا۔ عورت کو سمجھنا بہت
مشکل ہے۔

●●

"بیسویں صدی" نومبر ۷۹ء

سُونی ڈگر

آگ

جواں رات کا سیاہ آنچل ساری کائنات کو اپنی آغوش میں لے چکا تھا۔ وہ نیند لانے کی کوشش میں بہت دیر سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ لیکن ..... آج ... ... نہ جانے کیوں نیند اس کی آنکھوں سے دور بہت دور تھی ... ... اس نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ سرکایا ... ... باہر چاندنی کا ساگر بہہ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ اس ساگر میں ڈوب جائے۔ لیکن دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی ہمت اسمیں نہیں تھی ـــــ "اتنی رات گئے باہر لان میں دیکھ کر لوگ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے۔"

"جیسے اب بھی وہ کوئی دوشیزہ ہو ـــــ" اسے اپنے آپ پر ہنسی آئی۔ اس کی ہم جماعت تو چار پانچ بچوں کی ماں بن چکی ہیں۔ اس کی بھی اگر شادی ہو چکی ہوتی تو وہ بھی چار نہیں تو دو بچوں کی ماں ضرور ہی بن گئی ہوتی۔ پھر یہ خوف کیسا؟ کسی کے کچھ کہنے کا ڈر کیوں ..؟؟ لیکن نہیں، وہ عورت ہے اور عورت ابھی بھی ہمارے سماج میں چھوئی موئی کا پودا ہے۔

بات کس قدر معمولی تھی۔ شام میں اس کا کوئی پرانا کلاس میٹ اس سے ملنے کے لئے ایک عرصہ بعد آیا تھا۔ اسے دیکھ کر اسے عمرِ رفتہ کی یاد آگئی تھی۔ دیر تک وہ دونوں ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے رہے تھے۔ اور جب وہ جانے لگا تو وہ اپنے بڑے سے کمپاؤنڈ جو کئی مکانوں کا مشترکہ کمپاؤنڈ تھا کے آخری گیٹ تک اسے چھوڑنے آئی تھی۔

اس کے چلے جانے کے بعد جب وہ اپنے مکان میں داخل ہو رہی تھی تو اپنی پڑوسن کی جانی پہچانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ شاید وہ کسی سے کہہ رہی تھیں۔

"شادی نہ کر کے کیسے گلچھرے اڑا رہی ہے یہ عورت ....." اور جیسے کسی نے اچانک اسے دہکتی ہوئی بھٹی میں ڈال دیا ہو، وہ بالکل تلملا اٹھی۔ اس کی خواہش ہوئی کہ وہ دو ٹوک انھیں کچھ سنا دے لیکن اس نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا بلکہ خاموشی سے اپنے بیڈ روم میں آکر ویران بستر پر کروٹیں بدلنے لگی تھی۔

اس شہر میں سروس کرتے ہوئے اسے اب تو تقریباً بیس سال ہونے جا رہے تھے جب اس نے پہلی بار یہاں کالج میں لکچرار کی حیثیت سے تقرری پائی تھی اس وقت وہ کتنی نازک اور کومل سی تھی لیکن اب تو پکی عورت بن چکی ہے۔ گوشت کی موٹی موٹی تہیں اس کی کمر اور پیٹ کے گرد اس طرح پھیل چکی ہیں کہ کمر اور پیٹ کے مابین فرق ہی نہیں رہا ـــــ کبھی کبھی آئینہ میں سراپا دیکھ کر اس پر اداسی کی موٹی چادر تن جاتی ہے ـــــ کیا خوبصورت وہ دن تھے جب اس کا شمار بھی حسینوں میں ہوتا تھا۔ معمولی پوشاک بھی پہن لیتی تو کتنی نکھر جاتی تھی۔ ـــــ لیکن اب ..... اب تو اتنا گہرا میک اپ بھی اس کے چہرے کی شکنوں کو

بھر نہیں پاتا ہے۔ وقت کی یہ کیسی بے رحمی ہے۔

اسے اپنی مرحومہ ماں کی بات آج رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ اس شہر میں نوکری کرنے کے لئے جب وہ پہلی بار اپنا وطن چھوڑ کر آ رہی تھی تو ماں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا تھا ——

"بیٹی! ذرا اچھے سے رہنا" تو نہیں سمجھ سکتی کہ ایک ماں کو اپنی بیٹی کی ہتھیلیوں میں مہندی لگا کر رخصت کرنے میں جو سکھ ملتا ہے، وہ لڑکی کو نوکری پر بھیجنے میں نہیں ——"

اور اس وقت وہ اپنی ماں کو ایک نری جاہل ماں سمجھ کر تیزی سے رکشا پر چڑھ بیٹھی تھی۔ رکشا گھر سے اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگا تھا اور اس کا دل و دماغ نوکری کے نشہ میں سرشار تھا —— لیکن یہ سرشاری کی کیفیت کس قدر جلد ختم ہو گئی —— اور جب اس کا نشہ ٹوٹا تو کوئی چپکے سے اس کے من کا پٹ کھول کہہ رہا تھا:

"پونو! اب تو دیر، بہت دیر ہو گئی۔ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا ——"

●●

ماہنامہ "گلبن" گولڈن جبلی ۱۹۸۲ء

وہ لڑکی

وہ کرشن چندر کا "کالو بھنگی" نہیں لیکن ہاں ایک صغیر سن، معصوم سی بچی ضرور ہے جو میرے ذہن کے پردے پر اس طرح نقش ہو گئی ہے کہ آج نو دس سال کے عرصے بیت چکے لیکن میں اس معصوم سی میلی کچیلی بچی کو بھلا نہ سکی ہوں ـــــ کرشن چندر کے کالو بھنگی کی طرح وہ بچی بھی بارہا مجھ سے اپنی توتلی زبان میں یہ سوال کر چکی ہے کہ:

"دیدی! تم مجھ پر کہانی نہیں لکھو گی ـــــ؟"

میں کرشن چندر تو نہیں جو "کالو بھنگی" جیسا شاہکار لکھ سکوں، لیکن ہاں، یادوں کی جس صلیب پر میں ایک مدت سے آویزاں ہوں، ان تلخ یادوں کو چند معمولی الفاظ کا روپ تو دے ہی سکتی ہوں ـــــ

ـــــ وہ پت جھڑ کے موسم کی ایک اداس اداس سی شام تھی۔ شام کا بوجھل پن بڑھنے لگا تھا ـــــ میرے خاوند نے دفتر سے واپس آتے ہی مجھ سے کہا ـــــ

"چلو کہیں باہر چلیں۔"

"کہاں ــــ ؟"

"کہیں بھی ....."

گیس اسٹوو پر میں نے جلدی سے چائے تیار کی، مرتبان میں سے بسکٹ نکال کر چائے ان کے سامنے رکھ دی اور خود ڈریسنگ ٹیبل کے قریب آکر میک اپ کرنے لگی ــ عورتوں کو باہر نکلنے کے تصور سے ایک مخصوص خوشی کا احساس ہوتا ہے شاید اس لئے کہ ان کے بیشتر لمحے قیدیوں کی صورت بسر ہوتے ہیں۔ میں بھی بے حد خوش تھی اس لئے فوراً تیار ہو کر 'ان' کے ساتھ ہو لی ــــــ ہم دونوں بغیر کسی ارادے کے سینما ہال کی طرف بڑھنے لگے۔ سینما ہال کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ فلم چھوٹنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے ــــــ انتظار خود ایک بلا ہے۔ مزید برآں اسٹیشن پہنچ کر گاڑی کا انتظار اور سینما ہال کے قریب جا کر فلم چھوٹنے کا انتظار ــــ کسی محبوب ستم کش کے انتظار سے کچھ کم صبر آزما نہیں ہوتا ــــــ

وہاں کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد میں نے اپنی اکتاہٹ کا اظہار کیا:

"سنو جی! یہ کیا بوریت ہے؟ ہم لوگ احمق کی طرح "کیو" میں کب تک لگے رہیں گے۔ چلو نا کہیں ٹائم (Time) پاس کیا جائے۔"

پکچر ہال کے قریب ہی حلوائی کی ایک دکان تھی۔ وہاں کی رابڑی بہت مشہور تھی۔ میرے شوہر نے سرگوشی میں کہا ــــ!

"چلو جب تک رابڑی کھا آئیں ــــ"

ہم دونوں رابڑی کی دکان پر پہنچ گئے۔ دکان بظاہر بڑی چھوٹی سی تھی مگر بھیڑ اچھی خاصی تھی۔ بیٹھنے کے لئے بھی کوئی خاص انتظام نہیں، لبِ سڑک ایک خستہ حال بنچ لگی ہوئی تھی ـــــ قریب ہی ایک گندا نالہ بہہ رہا تھا اور چاروں طرف کوڑا کرکٹ کا انبار ـــــ

لوگ کھڑے کھڑے ہی کھا رہے تھے اور جھوٹی پیالیاں اور پتّل پھینک پھینک کر کوڑا کرکٹ کے انبوہ میں اضافہ کرتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ ہم میں بیشتر تعداد ان افراد کی ہے جو احساس کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے انھیں یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔ حقیقتاً وہ جگہ کھانے کی نہیں غلاظت پھیلانے کی بن چکی تھی ـــــ لیکن اچھے خاصے سوٹ میں ملبوس لوگ بھی ہنس ہنس کر کھا رہے تھے اور کسی قسم کی گندگی کا احساس ان کی آنکھ یا ناک کو نہیں چھو رہا تھا۔ اسی لئے جب میں نے احساسِ ناگواری سے منہ سکوڑتے ہوئے اپنے 'ان' سے کہا:

"یہ کس کباڑ خانے میں آپ لے آئے مجھے ـــــ؟"

تو انھوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

"محلوں میں رہنے والوں کو کبھی کبھی کباڑ خانے کی سیر بھی کرنی چاہئے۔"

ان کی ضد کے آگے میں مجبور ہو کر وہیں بنچ پر بیٹھ گئی۔ فوراً ہی رابڑی کی دو پیالیاں ہمارے سامنے آگئیں، ان میں کھانے کے لئے لکڑی کے بنے ہوئے دو چھوٹے چمچ بھی تھے۔ میں نے تھوڑی سی رابڑی منہ میں ڈالا ہی تھا کہ اچانک میرے سامنے ایک نو دس سال کی میلی کچیلی لڑکی آ کھڑی ہوئی۔ لڑکی کا معصوم چہرہ گرد سے اٹا ہوا تھا اور اس کے چھوٹے چھوٹے بال تیل سے بے نیاز گھوڑے کے بال کی طرح کھڑے اور سُرخی مائل ہو رہے تھے۔ لباس

کے نام پر اس کے جسم ناتواں پر ایک پھٹی پرانی فراک تھی اور ایک میلی سی تنگ جانگیہ ـــــ نگاہوں میں غضب کی حسرت اور بے پناہ طمع، ناک کے نتھنے غیظ سے بھرے ہوئے ـــ میں نے اس کی طرف دیکھ کر بڑی کوفت محسوس کی، کھانے کے لئے میرے اٹھتے ہوئے ہاتھ اچانک رُک گئے ـــــــ میں نے بہت کوشش کی کہ انسانیت کے ناطے تھوڑی سی راٹبڑی اس کی ہتھیلی پر رکھ دوں مگر مجھے اپنی نفاست سے یہ ڈر تھا کہ دوبارہ اس لڑکی کو دیکھنے کی زحمت میں میں کہیں وہیں پر ابکائی نہ کر دوں، اس لئے میں نے نظریں چراتے ہوئے تقریباً اسے ڈانٹا:

"چل ہٹ یہاں سے۔"

مگر وہ بدستور اپنی جگہ براجمان رہی۔ اس کی حریصانہ نظریں میری پیالی پر ٹکی ہوئی تھیں۔

اچانک دور کوڑے پر کسی نے اپنی جھوٹی پیالی پھینکا اور وہ لڑکی بجلی کی سی سرعت سے اس جھوٹی پیالی کی طرف لپکی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے ایک کالے رنگ کا کتا اس پیالی پر ٹوٹ پڑا تھا، اور لڑکی کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی کثیف کتا اپنی لپلپاتی زبان سے پیالی کو چاٹ رہا تھا۔ لڑکی غم و یاس کی مورت بنی چپ چاپ حسرت بھری نگاہوں سے کتے اور پیالی کو دیکھ رہی تھی کہ اسی اثنا میں ایک اور پیالی زمین پر گری۔

اس بار لڑکی نے کتے پر فتح پا لیا تھا اور کوڑے پر گری ہوئی جھوٹی پیالی کو جس میں برائے نام ہی راٹبڑی ہوگی، اپنے ننھے منے ہاتھوں میں بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اور کتے سے بھی زیادہ حرص کے ساتھ پیالی کو اپنی ننھی سی زبان سے چاٹ رہی تھی ـــــــ

مجھ میں اس کریہہ منظر کو اب مزید دیکھنے کی تاب باقی نہیں تھی اس لئے میں اپنی بھری ہوئی پیالی وہیں بنچ پر چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی ——— پکچر ہال کی طرف بڑھتے ہوئے آدمی کی انیک شکلوں کو میں حیرت سے تک رہی تھی اور رہ رہ کر دماغ میں ایک ہی سوال اُٹھ رہا تھا :

——"کیا وہ بھی آدمی کا ہی ایک رُوپ تھا ——؟"

●●

علامتی کہانیاں

— فن میں تجربہ کی اہمیت سے کوئی
انکار نہیں کر سکتا —— لیکن ہاں شرط
یہ ہے کہ تجربہ محض تجربہ نہ ہو، فن بھی ہو۔"

—— قمر جہاں

بند کوٹھری

کسی نے اسے بتایا تھا کہ اس بند کوٹھری میں آدمی
کے مختلف اقسام بند ہیں، کوئی طویل القامت، کوئی پستہ قد،
کوئی سرخ و سفید، کوئی سیاہ فام، کوئی موٹا، کوئی دُبلا ——
غرض آدمی کے انیک روپ یہاں موجود ہیں، لیکن ان سب کی سوچ
کی دھارا ایک ہی ہے ——
نہ جانے وہ بھی کِن راستوں سے ہو کر اس بند کوٹھری
میں آگیا تھا —— اسے یہ قفل لگا کمرہ پسند نہیں آیا۔ وہ تو آزاد
فضاؤں میں پرواز کرنے کا خواہش مند تھا، —— اسے کون؟
—کب—؟ اور کیوں —؟ یہاں لے آیا تھا —— اب تو
اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا —— وہ اس سے باہر نکلنے
کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا لیکن اندھیرے کے باعث اپنے
ہم جنسوں سے ٹکرا جاتا —— اور اب اس بار بار کے جسمانی

اتصال میں اسے ایک انہونا کیف ملنے لگا ہے ..... ایک انوکھی لذت اس کے مشامِ جاں کو چھو جاتی ہے۔ بسا اوقات تو وہ بیچ میں گھبرا جاتا ہے اپنی اس نئی کیفیت پر ——— اور کبھی جھنجھلاہٹ بھی ہوتی ہے ——— کیا اس کی طرح سبھی اس کال کوٹھری میں آکر اپنی بینائی کھونے لگتے ہیں ———؟ وہ خود سے سوال کرتا اور خاموش ہو جاتا۔ لیکن اس کا تجسس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ خود کو پہچاننا اور اپنے ماحول سے باخبر ہونے کا شعور اس میں شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔

ایک خموش رات میں اس نے ماچس کی ایک تیلی جلائی اور اس پل بھر کی روشنی میں اسے ایسا لگا جیسے تمام لوگ رات بھر اس کوٹھری کے اندر ننگا رقص کرتے ہیں ——— اسے بڑی کراہیت ہوئی اس نظارے کو دیکھ کر اور وہ متوحش ہو گیا کہ کہیں ایک روز لوگ اسے بھی نامعلوم طریقے سے اس ننگے رقص میں شامل نہ کر لیں ———

اس خیال کے آتے ہی اس نے ہاتھ سے ٹٹول کر اپنے کپڑوں کو محسوس کرنا چاہا تو یہ محسوس کر کے اسے سخت حیرت ہوئی کہ اس کے کپڑے بھی جگہ جگہ سے مسک چکے تھے ——— اور اس کے جسم کو برہنہ کرنے پر آمادہ تھے ——— وہ اس مسکے ہوئے لباس کو سینا چاہتا تھا ——— لیکن یہاں نہ تو سوئی تھی نہ دھاگے

اور پھر ـــــ اندھیرے کے اس سیلاب میں اس کی
بینائی بھی تو ساتھ نہیں دے رہی تھی ـــــ
"لباس کی حفاظت اس کا دھرم ہے۔" بچپن میں تائی
گئی اپنے استاد کی یہ بات اسے یاد آئی اور وہ سوچنے لگا:
وہ زندگی گزارنے کے کیسے اونچے آدرش رکھتا تھا۔ آخر اس
تاریک کوٹھری میں وہ کیونکر آ گیا ـــــ؟ یہ بند کوٹھری تو
اسے گناہوں کا ایک دفتر پارینہ معلوم ہوتی ہے ـــــ
کتنی غلاظتیں ہیں یہاں، موٹی موٹی سیاہ دیواروں
سے کیسی بدبو آتی ہے اور پھر رات دن چڑ چڑ کرتی ہوئی
کپڑے پھاڑنے کی ہوسناک آوازیں، اس کی سماعت کو
کس طرح مجروح کرتی ہیں ـــــ لیکن ـــــ اسے حیرت تو ہے
ان لوگوں پر جو اس بند کوٹھری میں برسوں سے رہ رہے ہیں
ـــــ ان میں سے اکثر نے تو نہ جانے کتنے مہ و سال اس
کوٹھری میں گزار لئے ہیں لیکن وہ کس قدر خوش ہیں ـــــ کسی
کو بھی تو یہ احساس نہیں کہ وہ ننگے ہیں اور ننگا پن ذلت و
پستی کا مظہر ہے ـــــ آدم و حوا نے گندم کی تلاش
میں پروردگار عالم کی طرف سے عریانیت کی سزا بھگتی تھی
ـــــ ان لوگوں نے بھی ضرور کوئی گناہ کیا ہے، ضرور
کسی جرم کے مرتکب ہوئے ہیں جبھی تو لباس سے محروم
ہیں۔ آدم و حوا تو اپنا لباس کھو کر شرمسار تھے۔ لیکن
اس عہد کا آدم کتنا بے باک، کس قدر بے حیا ہو گیا ہے ـــــ؟

وہ اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ اتنے میں اچانک اسے ایک ناآشنا ہاتھ اپنے اوپر سرسراتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ خوف و ہراس کے عالم میں تقریباً چیخ پڑا:

"مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ، میں ننگا ہونا نہیں چاہتا، مجھے عریانیت سے نفرت ہے۔ میرے کپڑوں کو نہ پھاڑو، میرے لباس کو نہ پھاڑو۔"

اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے گرد ایک مضبوط حصار کھینچ لینے کی کوشش کی ——

اس کی اس مجنونانہ کیفیت کو دیکھ کر اس کے قریبی دوستوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور سب نے بیک آواز کہا:

"میرے یار! اگر تمھیں اپنے جسم کی حفاظت مقصود تھی تو اس بند کوٹھری میں کیوں آئے ——؟ اس حمام میں تو سب ننگے ہیں۔ ہمارے قریب آئے ہو تو اب ہماری ہی صورت میں تمھیں بھی جینا ہوگا ——"

یہ کہہ کر دو چار ہاتھ اندھیرے میں ہی تیزی سے اسکی طرف بڑھے اور وہ پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے بے ہوش ہوگیا۔

بند کمرے کے نواسیوں نے کہا:

"بے چارہ نومولود ہے، کچھ دن میں جینے کے ڈھنگ خود ہی سیکھ لے گا —— ابھی تو بے چارہ آدرش و اصول کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے ——"

●●

ماہنامہ "شاعر" بمبئی۔ شمارہ (۹)، سنہ ۱۹۸۰ء

لمحوں کی صدا

وہ وقت کے صحرا میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ ہر طرف آندھیاں سی اٹھ رہی تھیں ——— خوفناک، بھیانک آندھی ——— لوگ کہتے ہیں اس شہر میں ایسی آندھی کبھی نہیں آئی تھی ——— دہشت ہر دہلیز پر کھڑی اپنی وحشت ناک صورت دکھا رہی تھی ——— سب لوگ اپنے مکان کے دروازے اور کھڑکیاں بند کئے ہوئے تھے ———

اچانک ایک اجنبی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی ——— "تم خاموش کیوں کھڑے ہو ——؟ جلدی سے کسی مکان میں گھس جاؤ، ورنہ آندھی تمھیں اڑا لے جائے گی۔"

اور وہ سوچ رہا تھا ——— "اس کی پناہ گاہ کون سی ہے۔؟ کیا وہ کسی غیر کے مکان میں گھس جائے ——؟"

"نہیں ... نہیں ... یہ تو غیر شریفانہ حرکت ہوگی۔"

پھر وہی آواز ابھرتی ہے ——

"تم ابھی تک کیا سوچ رہے ہو، آؤ جلدی سے میرے ساتھ آجاؤ، ورنہ بڑھتی ہوئی آندھی تمہارا راستہ روک لے گی ——"

—— وہ آواز کی سمت بڑھنے لگا —— اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اسکی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی ہیں اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر تقریباً اسے گھسیٹتے ہوئے بھاگنے لگا ہے —— تیز تیز چلنے کی وجہ سے وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا —— اس کی آنکھوں پر پٹیاں تھیں اس لئے وہ آندھی کے خوف سے محفوظ تھا۔ لیکن ایک انجانا خوف اس کے دل میں سر اٹھا رہا تھا ——

"یہ آدمی کون ہے ——؟ اسے کس سمت لے جا رہا ہے؟؟"

اس نے غلطی کی، یہ اس آدمی کی پہلی بات مان لیتا اور کسی بھی مکان میں گھس جاتا —— لیکن اس کے سامنے تو اس کی شرافت آکھڑی ہوئی تھی ——

اور اب محسوس ہوتا ہے کہ شرافت کے چکر میں پڑکر وہ شاید حماقت کر بیٹھا ہے ——

"لیکن اس کا صحیح جواب تو آنے والا وقت ہی دے سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے دل کو تسلّی دی ——

کانٹے دار جھاڑیوں سے گزرتے ہوئے اس کے قدم گھائل ہو چکے تھے۔ وہ درد کی شدّت سے بلبلا رہا تھا لیکن اس کے رہبر کو اس پر ذرا بھی رحم نہیں آرہا تھا ——

اس نے سوچا ——" نہ معلوم تقدیر میں کیا لکھا ہے؟" وہ تقدیر کا بندہ بنا اپنے 'رہبر' کے قدم سے قدم ملائے نامعلوم سمتوں میں سفر کرتا رہا —— ایک لمبی مسافت طے کرنے کے بعد اس آدمی نے اسے ٹھہر جانے کا حکم دیا اور خود غائب ہو گیا ——

اس مقام پر پہنچ کر اسے احساس ہوا جیسے وہ کسی رہ گزر پر کھڑا ہے یا کسی دفتر کے دروازے پر جہاں ہر آنے جانے والا راہی اس کے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگاتا ہوا گزر جاتا ہے —— وہ زیر لب کبھی ان راہوں کو گالی دیتا ہے اور کبھی اپنے رہبر کو جو اسے یہاں تک کھینچ لایا تھا اور اب بیچ چوراہے پر اسے تنہا چھوڑ کر خود نہ جانے کن راہوں میں گم ہو گیا ہے۔

چند ساعتوں کے بعد اچانک پھر اسی آدمی کی تحکمانہ آواز گونجی ——

" چلو' اندر چلو" —— وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا —— مدوّر چوبی زینے سے وہ اوپر کی بجائے

نیچے اتر رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کسی تہہ خانے میں جا رہا ہو ـــــ خوف و ہراس سے اس کی قوتِ گویائی صلب ہو چکی تھی ـــــ آنکھوں پر پٹیاں بندھی تھیں اس لئے وہ صرف محسوس کر سکتا تھا، دیکھ کچھ بھی نہیں سکتا تھا ـــــ

نیچے پہنچ کر اس آدمی نے اس کی آنکھوں پر بندھی پٹیاں کھول دیں ـــــ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا۔ ـــــ ایک بہت بڑے ہال میں وہ کھڑا تھا ـــ وہ ہال پرانے زمانے کی عمارت سازی کا نمونہ تھا ـــــ دریچے اور دروازے ہال کی وسعت کے لحاظ سے بہت کم تھے۔ چھت کے اوپر روشن دان کے لئے چھت کٹی ہوئی تھی، جس سے سورج کی کرن کمرے کو تھوڑا روشن بنائے ہوئے ہے۔ ـــــ اس نے دیکھا سامنے قدیم وضع کی ایک بڑی سی کرسی پر ایک بارعب شخصیت بیٹھی ہوئی ہے ـــــ اور اس کے دائیں جانب غالباً اس کا وہی 'رہبر' جو اسے یہاں تک لایا تھا، چہرے پر نقاب ڈالے کھڑا ہے ـــــ

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اپنے رہبر کو اور کبھی اس بارعب ہستی کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس بارعب شخصیت کے لب کو حرکت ہوئی۔

"تم اس دور کے بہت بڑے احمق ہو، آج کے دور میں جو شخص خود سے جینے کے طریقے نہیں جانتا، جانتے ہو

اس کی سزا کیا ہے ــــ ؟"

"نہیں۔"

اس نے بچّہ کی سی معصومیت سے نفی میں سر ہلایا۔ مگر اس کے چہرے کا رنگ فق ہو رہا تھا ــــ

"اس کی سزا موت ہے، موت ــــ"

ایک کرخت آواز اس کی سماعت کو چھیلتی ہوئی گذر گئی۔

"لیکن میں..... میں مرنا نہیں چاہتا ــــ" وہ چھوٹے بچّے کی طرح گھگھیانے لگا ــــ

"مگر تم نے جینے کا حق کھو دیا ہے۔ آج کے انٹرویو میں تم ایک ناکام Applicant رہے۔ یہ بات تمھیں شاید معلوم نہیں کہ اس دور میں جینے کے لئے 'کوہکنی' ہی نہیں 'ہوشیاری' بھی چاہئے ــــ تم ایک اچھے 'کوہکن' بن سکتے ہو لیکن ایک ہوشیار شہری نہیں ــــ اور تمھارے شہر کو 'کوہکن' (محنت کش) سے زیادہ ہوشیار شہری کی ضرورت ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا مادام ــــ!"

اس نے بمشکل ہکلاتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔ ــــ

"اسی لئے تو کہتی ہوں کہ تمھاری سزا موت ہے، موت ــــ"

اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا ــــ (شاید پڑوس کے کسی بچّہ نے پٹاخہ چھوڑا ہوگا)

اس کی آنکھ کھل چکی تھی ــــ

اور وہ خواب اور خیال کی باتوں میں

نئی معنویت تلاش کر رہا تھا ——

••

(فکشن سیمینار — بہار اردو اکاڈمی پٹنہ
بتاریخ ۱۱ مارچ ۱۹۸۱ء میں یہ کہانی پڑھی گئی)

صدا بصحرا

آواز کے گھنے جنگل میں جب اسے اپنی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی محسوس ہوئی تو وہ بے حد متوحش ہوئی، اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور اس کے ہاتھ میں 'نیا قلم' کانپنے لگا، جسے وہ کل ہی مارکیٹ سے بہت قیمت دے کر خرید لائی تھی ـــــ اور صبح تک اس قلم کو وہ بڑے اعتماد اور فخر کے ساتھ کاغذ پر گھستی رہی تھی لیکن اسے اب نہ تو اپنے قلم پر اعتماد رہا اور نہ اپنی آواز پر ـــــ کسی نے اسے بتایا تھا کہ آواز کے ڈوب جانے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مُردہ ہو گئی ـــــ اور وہ خود کو مردہ تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی تمنا، ہر ذی روح کی بنیادی تمنا ہے ـــــ اس تمنا کے بیدار ہوتے ہی اس نے اپنے اِرد گِرد ریشم کے کیڑے

کی طرح ریشمی حصار بنالینا چاہا۔۔۔۔ لیکن اس کی سوچ نے اسے سمجھایا کہ اس طرح تو وہ اور بھی محدود ہو جائے گی اور اس کی آواز خول سے باہر بھی نہیں نکل سکے گی۔ لہٰذا اپنے تحفظ کے لئے اس کے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا اور آنِ واحد میں اسے وہ عملی جامہ پہنانے کے عمل میں مصروف ہوگئی ——

اس نے کوڑے کرکٹ کے انبار سے ایک تیشہ اٹھایا۔ تیشہ کی کُند دھار کو پہلے آبدار بنایا پھر پوری تن دہی کے ساتھ جنگل کو کاٹنے لگی۔ اسے اس خیال سے آسودگی مل رہی تھی کہ اس طرح وہ اس بیکراں دشت میں اپنی انفرادیت کا سِکّہ جما سکے گی —— اور اپنی آواز میں وہ وقار پیدا کرے گی جو اسے دائمی زندگی عطا کرسکے گی —— اس کے ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ اس زمانہ میں زندہ رہنے کے لئے انفرادیت کی ڈگر پر چلنا ضروری ہے ——

جنگل کو تراشنے کے عمل میں اس کے ہاتھ لہولہان ہوگئے، دامن تار تار ہوگئے، لیکن اسے ان باتوں کی مطلق پروا نہ تھی، بلکہ وہ "قلم ہوئے ہاتھ" اور تار تار دامن کو اپنی کامیابی سمجھتی تھی اور بڑے فخر کے ساتھ وہ اپنے لہولہان ہاتھوں کو فضا میں مرغولے بنا کر اچھالتی رہتی۔

سخت محنت و مشقت سے اس کی خوبصورت پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے اُبھر آتے جنھیں وہ اپنے ریشمی آنچل سے بڑی احتیاط سے صاف کر لیتی اور اپنے کام میں محو ہو جاتی ——

روز و شب کا چکر چلتا رہا، لمحے روز میں اور روز سہ و سال میں تیزی سے بدلتے رہے —— لوگ اس کی دیوانگی پہ حیران تھے، لیکن وہ خود مطمئن تھی؛ اسے یقین تھا کہ ہر تخریب کے پیچھے تعمیر کی جھلک پوشیدہ ہوتی ہے —— وہ بڑی لگن اور محنت کے ساتھ تناور درختوں، مضبوط شاخوں اور موٹی موٹی ٹہنیوں کو توڑتی مروڑتی رہتی —— نہ جانے کتنے شجر سایہ دار، پھل دار پودے اور ہری بھری ڈالیاں اس کی وحشت کا نشانہ بنے —— شاید اسے اس وحشیانہ عمل میں ایک نفسیاتی حظ مل رہا تھا۔ ایک سکون اور لطف کا احساس ہو رہا تھا —— جبھی تو تھکن کے باوجود وہ مطمئن اور آسودہ نظر آتی تھی —— اور —— اور ایک دن ایسا آیا کہ وہ اس جنگل میں تنہا ببول کے پیڑ کی طرح لنڈ منڈ کھڑی رہ گئی —— یہ دن اس کے لئے بڑی مسرت کا دن تھا —— وہ فتح کے احساس اور "گرمیٔ نشاط تصور" سے ایسی سرشار ہوئی کہ چند لمحے کے لئے اسے اپنی آنکھوں کی بینائی کھوئی ہوئی محسوس ہوئی۔ لیکن جب اپنی بے انتہا مسرت کو وہ ضبط میں لایا اور آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا تو اسے دکھائی دیا

کہ جنگل تو واقعی اس کی محنت سے ریگستان میں تبدیل ہو چکا ہے۔ لیکن وہ جہاں تھی، وہ..... وہیں کھڑی ہے اور اسکی آواز صحرا میں صدا بہ صحرا بن کر بازگشت کر رہی ہے۔

مگر آج..... ایک عرصہ کی محنت و مشقت کے بعد اس پر یہ راز کھلا کہ اس کی یہ دوسری آواز تو پہلی آواز سے بھی زیادہ کھوکھلی اور بے جان ہے۔

••

ماہنامہ "آہنگ" گیا۔ اگست ۱۹۸۲ء

میں کی تلاش میں

اس کے اندر عجیب سی ٹوٹ پھوٹ مچی ہوئی تھی۔ کچھ کہنے اور نہ کہنے کا کرب اس پر ایک افسردگی کی کیفیت طاری کئے ہوئے تھا ——— وہ بے چینی کے عالم میں سونی رات میں لائٹ جلاتی، بستر چھوڑ کر ٹیبل کے قریب آتی ——— سفید، بے داغ کاغذ پر کچھ تحریر کرنے کی کوشش کرتی پھر ایک عجیب سی اکتاہٹ سے دوچار ہو کر واپس بستر پر آجاتی ———

رات کا نصف پہر بیت چکا تھا، نیند کی پریاں کہیں دور خلاؤں میں گم تھیں۔ پپوٹے بھاری ہو چکے تھے۔ سر میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو چکا تھا ——— وہ سوچ رہی تھی، تخلیق کا کرب بھی کتنا شدید ہوتا ہے۔

اس دفعہ وہ بستر سے اٹھی تو اپنے خشک ہوتے ہوئے حلق کو پہلے تر کیا۔ ایسا کرنے سے اس

کا ذہن بھی قدرے تر ہو چکا تھا اور سر بھی ہلکا معلوم ہونے لگا ——— اندھیرے روم میں پھر اجالا پھیل گیا اور اس کی تنہائی گنگنا اٹھی ———
کوئی چیز اس کے ذہن میں چمک رہی تھی، ہیرے کی کنی کی طرح ——— آگہی کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اچانک آسمان سے ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی ——— اسے اپنا سارا وجود اس پھوار میں بھیگتا ہوا محسوس ہوا ———
اچانک اس نے دیکھا، سیپ کے منہ سمندر کی سطح میں کھل چکے ہیں اور قطرۂ نیساں کو اپنے وجود میں ضم کرنے کے لئے بے قرار ہو رہے ہیں ———
موقع غنیمت سمجھ کر اس نے بے محابا قلم ہاتھ میں اٹھا لیا ——— اب تک تصویر دھندلی اور مجرد شکل میں تھی، اسے کوئی قطعی صورت دینا ——— ایک مسئلہ ——— عام نظر میں ایک چھوٹا سا مسئلہ ——— لیکن بسا اوقات یہ چھوٹا سا مسئلہ کتنا بڑا مسئلہ بن جاتا ہے ———
لیکن آج کی رات اسے اس مسئلہ کو حل کرنا ہی ہوگا ورنہ حریری پردوں سے جو خوبصورت سا ہیولیٰ کبھی کبھی شعور کی سطح پر جھلکا اٹھتا ہے۔ کہیں وہ ہمیشہ کے لئے معدوم نہ ہو جائے ——— بکھرے ہوئے سایوں کو سمیٹنے کی کوشش بھی کیا خوب ہوتی ہے ——— ؟
قلم اس کے ہاتھ میں تھا ——— اس وقت

اسے اپنا سارا وجود درد کے اتھاہ سمندر میں ہچکولے لیتا ہوا محسوس ہو رہا تھا ——

اس نے اپنی شخصیت کے سارے کرب کو سمیٹ کر، نچوڑ کر بس ایک لفظ یا زیادہ سے زیادہ ایک جملے میں منتقل کر دینا چاہا تھا —— وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو چکی تھی —— لیکن اب اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ درد لفظوں میں سمٹ کر بے مایہ ہو چکا ہے —— اس کی آنکھوں سے رنگین کاغذ پر دو اشک گرے اور اس طرح ثبت ہو گئے جیسے یہ قطرے آنسو کے نہیں اس کے دل کے خون ہوں ——

اس نے انھیں چوم لیا اور اس کا چہرہ احساس طمانیت سے کھل اٹھا تھا کہ، میں نے وہیں کی تلاش مکمل کر لی تھی ——

●●

۲۴ ستمبر ۱۹۸۲ء

ملائکہ میری آواز سُن رہے ہو تم ؟
سنی ہے پہلے بھی تم نے ضرور یہ آواز
مگر وہ پہلی سی معصومیت نہیں ہے آج
تمام کرب زمانے کا بھر گیا اس میں
جو زہر زیست میں ہے سب اتر گیا اسمیں

NIKHAR PUBLICATIONS
MAUNATH BHANJAN (U. P.) 215101